



ترجمانِ زبور

منظوم اُردو ترجمہ

مترجمہ

جسٹس (ریٹائرڈ) ایس۔ اے۔ رحمان



مصعب



✓



ترجمانِ زبور

منظومِ اُردو ترجمہ

مترجمہ

جسٹس (ریٹائرڈ) ایس۔ اے۔ رحمان

نیشنل کمیٹی برائے صالحہ تقریبات و لادیت علامہ محمد اقبالؒ

اقبال اکادمی پاکستان

۹۰-بی-۲-گلبرگ ۳ ○ لاہور

جمالہ حقوق محفوظ ہیں

ڈاکٹر محمد معز الدین : ناشر

ڈائریکٹر : اقبال اکادمی پاکستان

۹۰ بی - ۲ گلبرگ نمبر ۳ لاہور

رہن پرنٹنگ پریس لمیٹڈ : مطبع

باہتمام مرزا محمد صادق

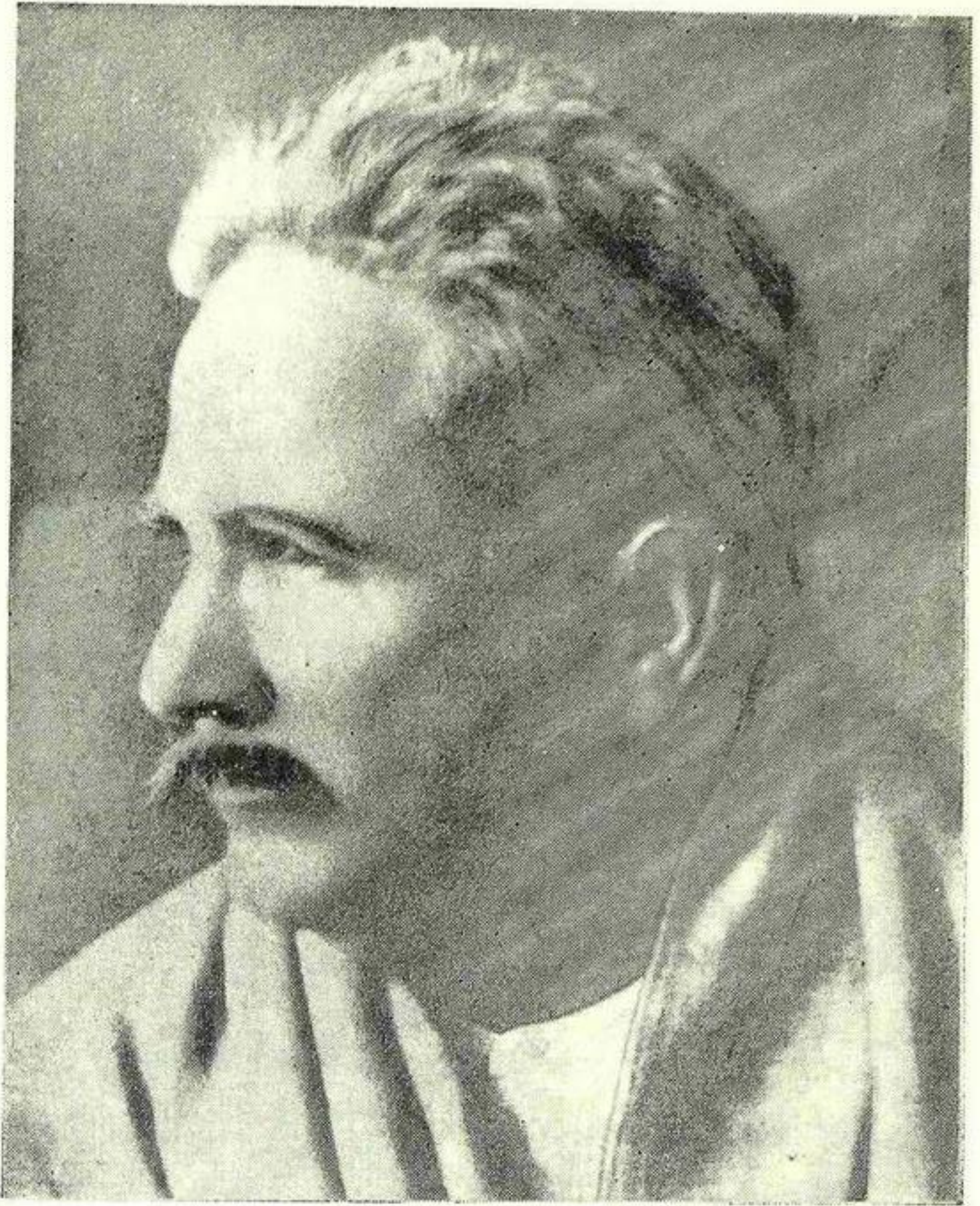
۳ - لیک روڈ لاہور

۱۹۷۷

طبع اول :

۱۱۰۰

تعداد :



علامہ محمد اقبالؒ

(۱۸۷۷—۱۹۳۸)

پیش لفظ

۱۹۷۷ء کو ایک سرکاری اعلان کے مطابق علامہ اقبالؒ کا سال قرار دیا گیا ہے۔ اسی سال نومبر میں علامہ کی پیدائش کو سو سال ہو جائیں گے۔ حکومت کے پیش نظر اقبالؒ کے جشنِ صدی منانے کا ایک دقیق پروگرام ہے۔ مجوزہ جشنِ صدی کے سلسلہ کی ایک کڑی علامہ کے فارسی کلام کو، تفہیمِ عوام کی خاطر، اردو نظم کے قالب میں پیش کرنا ہے۔ جشنِ صدی کی قومی کمیٹی کی مجلسِ منتظمہ نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کام کی ذمہ داری جناب فیض احمد فیض، جناب رفیق خاور اور راقم کو تفویض کی جائے۔ زرہ امثال اس راقم نے ”زبورِ عجم“ کے ترجمہ کا کام اپنے ذمے لیا۔



”زبورِ عجم“ کی اہمیت علامہ ہسی کے ایک شعر سے واضح ہوتی ہے۔ ”بال جبریل“ کی ایک غزل میں ارشاد ہوا ہے :

اگر ہو ذوق تو خلوت میں بڑھ زبورِ عجم

فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں

”ترجمانِ زبور“ علامہ کی ”زبورِ عجم“ کے حصہ

اول و حصہ دوم کے ترجمہ پر مشتمل ہے۔ ”گیشن

رازِ جدید“ اور ”بندگی نامہ“ کا ترجمہ اس میں شامل

نہیں ہے۔ ان دونوں حصوں کا رنگ اور اُن کی فضا

پہلے دو حصوں سے الگ ہے۔

ترجمہ شعر بہ شعر ہے۔ اس قسم کے ترجمہ کی

راہ میں جو مشکلیں حائل ہیں، اُن کا مجھے کماحقہ،

احساس ہے۔ پھر جب کلام علامہ اقبال جیسے نابغہ

روزگار کا ہو تو اصل کی ہشیت اور روح کو برقرار

رکھنے کا ارادہ حوصلہ طلب ہے۔ بہر حال جو کچھ





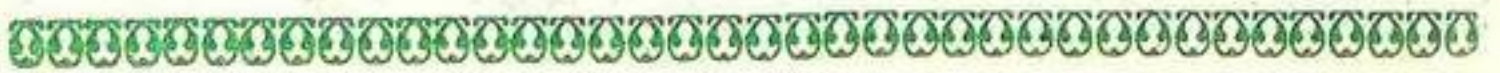
اس مختصر مدت میں ہوسکا ، پیش خدمت ہے ۔ ترجمہ
کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ قارئین کی صوابدید
پر ہے ۔

میں محبی صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کا تہہ دل سے
سپاس گزار ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کا مسودہ
بالاستیعاب دیکھا اور بعض نہایت مفید مشورے دئے ۔
انہوں نے بکمالِ عنایت پروف خوانی میں بھی مجھ سے
شرکت کی ہے ۔ میں ڈاکٹر معزالدین ، ڈاکٹر اقبال
اکادمی پاکستان ، لاہور کا بھی ممنون ہوں جن کا تعاون
اشاعتِ کتاب کے تمام مرحلوں میں مجھے حاصل رہا ۔

ایس ۔ اے رحمان

لاہور

۱۲ ستمبر ۱۹۷۷ء





ترجمانِ زبور

ایس - اے رحمن



بخواننده کتاب زبور

مئے شود پردہ چشم پر گاہ گاہ
دیدہ ام هر دو جہاں را بنگاہ گاہ

وادی عشق بسے دور و دراز است ولے
طے شود جادہ صد سالہ باہے گاہ

در طلب کوش و مدہ دامن امید ز دست
دولتے هست کہ یابی سرِ راہے گاہ

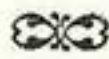


زبور کے قاری سے

آنکھ کا پردہ ہوا مجھ کو پرکاش کبھی
آنکھ میری دو جہاں سے ہوئی آگاہ کبھی

عشق کی وادی بہت دور ہے گرچہ لیکن
راہ صد سالہ ہوئی طے ہے بیک آہ کبھی

رشتہ امید سے قائم رہے ، پیہم ہو طلب
ایک دولت ہے کہ ملتی ہے سرِ راہ کبھی



زبورِ عجم
حصه اول

ز برونِ در گزشتم ، ز درونِ خانه گفتم !
سخنِ نگفته را چه قلندرانه گفتم !



زبورِ عجم

حصہ اول

دی برونِ در سے میں نے خبرِ درونِ خانہ!
جو کہی نہ تھی کسی نے وہ کہی قلندرانہ!



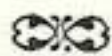
دعا

یا رب درونِ سینہ دلِ با خبرِ بدہ
در بادہ نشہ را نگرَم، آن نظرِ بدہ
این بندہ را کہ با نفسِ دیگران نزیست
یک آہِ خانہ زادِ مثالِ سحرِ بدہ
سیلم، مرا بجوئے تنکِ مایہٴ مپیچ!
جولا نگرہے بوادی و کوه و کمرِ بدہ!
سازی اگر حریفِ یم۔ بیکرانِ مرا
با اضطرابِ موج، سکونِ گہرِ بدہ
شاهینِ من بصیدِ پلنگانِ گزاشتی!
ہمت بلند و چنگلِ ازین تیز تر بدہ
رفتم کہ طائرانِ حرم را کنم شکار
تیرے کہ نا فگندہ فتد کارگرِ بدہ
خاکم بہ نورِ نغمہٴ داؤد بر فروز
ہر ذرۂ مرا پر و بالِ شررِ بدہ



دُعا

یا رب تری جناب سے دل با خبر ملے
جو مے میں نشہ دیکھ لے، ایسی نظر ملے
اس بندے کو جو غیر کے بل پر نہیں جیا
اک آہِ خانہ زادِ مثالِ سحر ملے
الجہا نہ میرے سیل کو اک جوئے تنگ میں
میری گزر کو وادی و کوہ و کمر ملے
مجھ کو سمندروں کا کیا ہے اگر حریف
لہروں کو میری بے کلی، تہ کو گہر ملے
چیتوں کو میرے شاہیں کی زد میں جوھے رکھا
ہمت بلند، چنگل اسے تیز تر ملے
نکلا ہوں طائرانِ حرم کے شکار کو
وہ تیر بن چلے جو رہے کارگر، ملے
روشن ہو میری خاک فروغِ زبور سے
میرے ہر ایک ذرے کو تاب شرر ملے



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عشقِ شور انگیز را هر جاده در کوئے تو بُرد
بر تلاشِ خود چه می نازد که ره سوئے تو بُرد



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۱

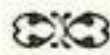
عشق ہر اک راہ سے پابستہ تجھ تک لے گیا
جستجو پر ناز کیا ، خود رستہ تجھ تک لے گیا



درونِ سینهٔ ما سوزِ آرزو ز کجا ست؟
 سبوزِ ما ست ولی باده در سبوزِ کجا ست؟
 گرفتم این که جہاں خاک و ما کفِ خاکیم
 بہ ذرہ ذرہٗ ما دردِ جستجو ز کجا ست؟
 نگاہِ ما بگریبانِ کہکشان افتد
 جنونِ ما ز کجا شورِ ہائے و ہُو ز کجا ست؟



کہاں سے سینہٴ انسان میں سوزِ آرزو آیا؟
 سبو میرا ، کہاں سے بادۂ آئینہ رو آیا؟
 یہ مانا خاک ہے عالم ، مرا تنِ مشتِ خاک کی ہے
 کہاں سے میرے ہر ذرے میں دردِ جستجو آیا؟
 نظر پڑتی ہے میری کمکشان کے بھی گریباں پر
 کہاں سے یہ جنوں آیا ، یہ شورِ ہائے وُہو آیا؟



غزل سراے و نواہائے رفتہ باز آور
 بایں فسردہ دلاں حرفِ دل نواز آور
 کنشت و کعبہ و بتخانہ و کلیسا را
 ہزار فتنہ ازاں چشمِ نیم باز آور
 زیادہ کہ بجاکِ من آتشے آمیخت
 پیالہٴ بجوانانِ نو نیاز آور!
 نئے کہ دل ز نوایش بسینہ می رقصد
 مئے کہ شیشہٴ جاں را دہد گداز آور
 بہ نیستانِ عجم بادِ صبحدم تیز است
 شرارہٴ کہ فرو می چکد ز ساز آور





غزل سرا ہو، سرودِ کہن کو دے آواز
سنا فسردہ دلوں کو نوائے قلب نواز
کنشت و کعبہ و بتخانہ و کلیسا پر
ہوں چشمِ نیم کشادہ سے فتنوں کے در باز
جو میری خاک میں شعلہ فشاں ہے آسِ مے سے
دے نونیاں جوانوں کو اک پیالہٴ ناز
وہ نے ہو جس کی نوا دل کو رقص میں لائے
وہ مے ہو شیشہٴ جاں جس سے پائے سوز و گداز
ہے نیستانِ عجم میں ہوا سحر کی تیز
شرر کہاں ہے کہ ٹپکائے میرا تارِ ساز

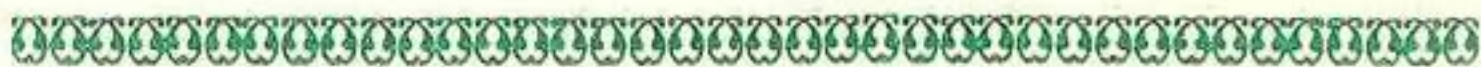


اے کہ زمنِ فزودہؑ گرمئی آہ و نالہ را
 زندہ کن از صدائے من خاکِ ہزار سالہ را
 با دلِ ما چہا کنی! تو کہ بیادہؑ حیات
 مستیؑ شوق می دہی آب و گلِ پیالہ را
 غنچہؑ دل گرفتہ را از نفسم گرہ کشائے
 تازہ کن از نسیم من داغِ درونِ لالہ را
 می گزرد خیالِ من از مہ و مہر و مشتری!
 تو بہ کمیں چہ خفتہؑ صید کن این غزالہ را
 خواجہؑ من! نگاہ دار آبروے گدائے خویش
 آنکہ ز جوے دیگران پُر نکند پیالہ را





مجھ سے ملی ہیں وسعتیں گرمی آہ و نالہ کو
میری صدا سے زندہ کر خاکِ ہزار سالہ کو
گزرے گی اپنے دل پہ کیا تو نے مرے حیات سے
مستیِ شوق کی عطا، آب و گلِ پیالہ کو
غنچہ کے دل کی ہر گرہ کھول سکے مرا نفس
تازگی دے مری صبا داغِ درونِ لالہ کو
مہر و مہ و ستارہ سے آگے نکل گیا خیال
سو یا ہے تو کمین میں کیوں، قید کر اس غزالہ کو
اے مرے خواجہ! لاج رکھ اپنے گداے خاص کی
غیر کی جُو سے پر نہیں جس نے کیا پیالہ کو

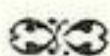


از مشتِ غبارِ ما صد ناله بر انگیزی
 نزدیک تر از جانی با خوئے کم آمیزی!
 در موجِ صبا پنهان دزدیده بباغ آئی
 در بوئے گل آمیزی، با غنچه در آویزی!
 مغرب ز تو بیگانه، مشرق همه افسانه
 وقت است که در عالم نقشِ دگر انگیزی!
 آنکس که بسر دارد سودایِ جهانگیری
 تسکینِ جنونش کن با نشترِ چنگیزی!
 من بندهٔ بے قیدم شاید که گریزم باز
 این طرهٔ پیچاں را در گردنم آویزی
 جز ناله نمی دانم گوئند غزل خوانم
 این چیست که چون شبم به سینهٔ من ریزی؟



پیہم تنِ خاکی کو کیا تو نے فغاں خیز
 نزدیک تراز جاں ہے مگر نحو میں کم آمیز!
 پردے میں صبا کے تو چھپا ، باغ میں آیا
 خوشبو میں سایا ہے تو غنچے میں نمو بیز!
 مغرب ترا بیگانہ تو مشرق ہے فسانہ
 ہے وقت ، بنے نقش کوئی اور دل آویز!
 جس سر میں جہانگیری کا سودا کہیں ابھرے
 ہو آس کا مسیحائے جنوں نشترِ چنگیز!
 میں بندہ آزاد ہوں ، پھر ہوں نہ گریزاں
 گردن میں حائل ہو ترا 'طرہ' شبدیز
 نالہ ہوں سراپا، مجھے سمجھے ہیں غزل خواں
 یہ اوس سی کیا ہے مرے سینے پہ گہر ریز؟

من اگرچہ تیرہ خاکم دلکے است برگ و سازم
 بنظارہءِ جمالے چو ستارہ دیدہ بازم
 بہ ہوائے زخمہءِ تو ہمہ نالہءِ خموشم
 تو باین گہاں کہ شاید ز نوا فتادہ سازم
 بضمیرم آن چناں کن کہ ز شعلہءِ نوائے
 دلِ خاکیاں فروزم دلِ نوریان گدازم
 تب و تابِ فطرتِ ما ز نیاز مندیءِ ما
 تو خدائے بے نیازی نرسی بسوز و سازم!
 بکسے عیاں نکر دم ز کسے نہاں نکر دم
 غزل آنچنان سرودم کہ بروں فتادہ رازم!





ہوں تیرہ خاک مگر دل ہے برگ و ساز مرا
برائے دیدِ جوں انجم ہے دیدہ باز مرا
ہوں تیرے زخمہ کی حسرت میں نالہٴ خاموش
تجھے گہاں کہ نوا سے تہی ہے ساز مرا
وہ سوز دے کہ فروزاں کروں دلِ خاکی
سنے جو نوری تو نغمہ ہو دل گداز مرا
نیاز مندی سے فطرت مری ہے بے تابی
تو بے نیاز نہ پائے گا سوز و ساز مرا
عیان کیا نہ نہاں رکھا میں نے غیروں سے
غزل سرائی نے افشا کیا ہے راز مرا!



بصدائے درد مندے بنوائے دلپذیرے
 خمِ زندگی کشادم بچہانِ تشنہ میرے!
 تو بروئے نئے نوائے درِ آں جہاں کشادی
 کہ ہنوز آرزویش نہ دمیدہ در ضمیرے!
 ز نگاہِ سرمہ سائے بدل و جگر رسیدی
 چہ نگاہے سرمہ سائے! دو نشانہ زد بہ تیرے!
 بنگاہِ نارسایم چہ بہارِ جلوہ دادی
 کہ بیباغ و راغِ نالم چو تدر و نو صفیرے
 چہ عجب اگر دو سلطان بہ ولایتے نہ گنجد
 عجب این کہ می نگنجد بد و عالمے فقیرے!

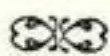
مری دردمند صدا اٹھی ، مری دلپذیر نوا اٹھی
 ہوئے جتنے پیاسے تھے جاں بلب ، انہیں مل گیا 'خیم زندگی' !

میں ہوں بے نوا مگر اے خدا ، وہ دکھایا تو نے مجھے جہاں
 ہوئی پیدا جس کی نہ آرزو کسی دل کی خلوتوں میں ابھی !

اٹھی یوں نظر تری سرمہ سا کہ دل وجگر میں اتر گئی
 دو شکار ایک ہی تیر سے ، ہے عجب نظر کی فسوں گری !

مری نارسا سی نظر کو بھی وہ بہارِ جلوہ عطا ہوئی
 کہ میں اب ہوں گویا تدر و جس کو زباں ملی ہو نئی نئی

نہیں یہ عجب کہ نہ رہ سکیں ایک مملکت میں دو حکمراں
 ہے عجب کہ وسعتِ دو جہاں نہ ہو اک فقیر کو مکتفی !



بر سرِ کفر و دینِ فشانِ رحمتِ عامِ خویش را
 بندِ نقابِ برکشا ماهِ تمامِ خویش را
 زمزمهٔ کهنِ سرانِ گردشِ باده تیز کن
 باز به بزمِ ما نگر، آتشِ جامِ خویش را
 دام ز گیسواں بدوش زحمتِ گلستانِ بری
 صیدِ چرا نمی کنی طائرِ بامِ خویش را
 ریگِ عراقِ منتظر، کشتِ حجازِ تشنه کام
 خرنِ حسینِ بازده کوفه و شامِ خویش را
 دوشِ براهبرِ زند، راهِ یگانه طے کند
 می ندهد بدستِ کس عشقِ زمامِ خویش را
 ناله باستانِ دیر بے خبرانه می زدم
 تا بحرمِ شناختم راه و مقامِ خویش را
 قافلهٔ بهار را طائرِ پیشِ رسِ نگر
 آنکه بخلوتِ قفس گفت پیامِ خویش را

فرق نہ کفر و دین میں ہو، اذن دے فضلِ عام کو
 زیرِ نقاب اب نہ رکھ، اپنے وہ تمام کو
 زمزمہ کہن سنا، گردشِ بادہ تیز کر
 بزم میں آ کے دیکھ پھر آتشِ تیزِ جام کو
 شانہ پہ دامِ گیسواں رکھ کے چلا ہے باغ کو
 کرتا نہیں شکار کیوں اپنے عقابِ بام کو
 ریگِ عراق منتظر، پیاسی حجاز کی زمیں
 خونِ حسین پھر ملے کوفہ و خاکِ شام کو
 چھوڑ کے رہنا چلا، تنہا ہی رہ گرا ہوا
 دے گا نہ دستِ غیر میں عشق کبھی زمام کو
 نے خبری میں نالہ زن دیر کے آستان پہ تھا
 آ کے حرم میں پا لیا اپنے رہ و مقام کو
 قافلہ بہار کا طائرِ پیش رس ہوں میں
 اپنے قفس میں رہ کے ہی نشر کیا پیام کو

نوائے من ازاں پر سوز و نے باک و غم انگیز است
 بخاشاکم شرر افتاد و بادِ صبحدم تیز است
 ندارد عشق سامانے و لیکن تیشہء دارد
 خراشد سینہء کہسار و پاک از خونِ پرویز است
 مرا در دل خلید این نکته از مردِ ادا دانے
 ز معشوقان نگہ کاری تر از حرفِ دلاویز است
 بیالینم بیا یکدم نشیں کز دردِ مہجوری
 ہی پیمانہء بزم ترا ، پیمانہ لبریز است
 بہ بستان جلوہ دادم آتشِ داغِ جدائی را
 نسیمش تیز تر می سازد و شبم غلط ریز است
 اشارتہائے پنہان خانمان برہم زند لیکن
 مرا آن غمزہ می باید کہ بیباک است و خونریز است
 نشیمن ہر دورا در آب و گل لیکن چہ راز است این
 خرد را صحبتِ گل خوشتر آید ، دل کم آمیز است
 مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی
 برہمن زادہ رمز آشناے روم و تبریز است

نوا میری ہوئی پرسوز ، لے باک اور غم انگیز
 مرے نحس میں پڑی چنگاری اور بادِ سحر ہے تیز
 نہیں ہے ایک تیشہ کے سوا کچھ عشق کا سامان
 یہ چیرے سینہ کہسار لے داغِ دم پرویز
 مرے دل میں خلش گرھے یہ نکتہ اک ادا داں کا
 نگہ محبوب کی ہے کاری تر از حرفِ دلاویز
 مرے بالیں پہ آ اور بیٹھ جا ، دردِ جدائی سے
 بس اب ترے تہی پیمانہ کا پیمانہ ہے لبریز
 دکھایا جلوہ میں نے آتشِ ہجراں کا گلشن میں
 ہوا نے اور بھڑکایا اسے ، شبِ نیم ہوئی کج ریز
 یہ مانا خانہ بر انداز ہیں پنہاں اشارے بھی
 وہ غمزہ چاہئے مجھ کو جو ہو لے باک اور خونریز
 نشیمن دونو آب و گل میں رکھتے ہیں مگر یہ کیا
 خرد تو صحبتِ گل سے ہے خوش اور دل ہے کم آمیز
 مجھے دیکھو کہ مجھ سا ہند میں کوئی نہ پاؤ گے
 برہمن زادہ کو سمجھا گئے کچھ روم اور تبریز

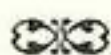
۱ - دم - خون -

دل و دیدہ کہ دارم ہمہ لذتِ نظارہ
 چہ گنہ اگر تراشم ضمے ز سنگِ خارہ
 تو بہ جلوہ در نقابی کہ نگاہ بر نتابی
 مہ من! اگر ننالیم تو بگو دگر چہ چارہ!
 چہ شود اگر خرامی بسرے کاروانے
 کہ متاعِ ناروانش دلکے است پارہ پارہ
 غزلے زدم کہ شاید بنوا قرارم آید
 تپِ شعلہ کم نہ گردد ز گسستنِ شرارہ
 دلِ زندہ کہ دادی بہ حجاب در نسازد
 نگہے بدہ کہ بیند شررے بہ سنگِ خارہ
 ہمہ پارہ دلم را ز سرورِ او نصیبے
 غمِ خود چساں نہادی بدلِ ہزار پارہ!
 نکشد سفینہ کس بہ یم بلند موجے
 خطرے کہ عشق بیند بسلامتِ کنارہ!
 بشکوہ لے نیازی ز خدایگان گزشم
 صفتِ مہ تمامے کہ گزشت بر ستارہ!

دل و دیدہ جب سراپا ہوئے لذتِ نظارہ
 تو میں کیوں نہ پھر تراشوں کوئی بت زسنگِ خارہ
 ترا جلوہ بھی ہے پردہ کہ نظر نہ رخ پہ ٹھہرے
 مرے ماہ! نالہ گرہوں، مرا اور کیا ہے چارہ!
 کبھی آہی نکلے تو بھی مری کاروانسراے میں
 میرے پاس جنسِ کاسدھے دل ایک پارہ پارہ
 میں غزل سرا ہوا تھا کہ قرار آئے جی کو
 تپِ شعلہ کیسے کم ہو، بہ شکستِ یک شرارہ
 دلِ زندہ جب دیا ہے تو حجاب کیوں ہو حائل
 وہ نظر ملے کہ دیکھوں میں شررِ درونِ خارہ
 مرے دل کے ریزے ریزے نے سرورِ آس سے پایا
 ترا غم سما یا کیسے بہ دلِ ہزار پارہ
 نہ چلا سکیگا کشتی کسی کی میانِ طوفاں
 وہ جو خطرہ عشق کو ہے بسلامتِ کنارہ
 میں بہ شانِ بے نیازی یوں خدایگان سے گزرا
 چلے جیسے ماہِ کامل پرے چھوڑ کر ستارہ!

گرچہ شاہینِ خرد بر سرِ پروازے هست
 اندرین بادیہ پنہاں قدر اندازے هست
 آنچه از کارِ فروبسته گرہ بکشاید
 هست و در حوصلهٔ زمزمہ پردازے هست
 تابِ گفتار اگر هست شناسای نیست
 وائے آن بندہ کہ در سینۂ او رازے هست!
 گرچہ صد گونه بصد سوز مرا سوخته اند
 اے خوشا لذتِ آن سوز کہ ہم سازے هست
 مردہ خاکیم و سزاوارِ دلِ زندہ شدیم!
 این دلِ زندہ و ما! کارِ خدا سازے هست!
 شعلۂ سینۂ من خانۂ فروز است ولے
 شعلۂ هست کہ ہم خانۂ بر اندازے هست!
 تکیہ بر عقلِ جہاں بینِ فلاطون نکنم
 در کنارم دلکے شوخ و نظر بازے هست!

گرچہ شاہینِ خرد بر سرِ پرواز رہا
 لیکن اس دشت میں پنہاں قدر انداز رہا!
 وہ فسوں، کارِ فروبستہ کی کھولے جو گِرہ
 خاصہٗ حوصلہٗ زمزمہ پرداز رہا
 تابِ گفتار تو ہے کوئی شناسا ہی نہیں
 آہ وہ جس کا نہاں سینے ہی میں راز رہا!
 گرچہ سو رنگ میں بخشا گیا ہے سوز مجھے
 لذتِ آس سوز کی جو سوزِ ہوا، ساز رہا
 خاکِ مردہ تھے، سزاوارِ دلِ زندہ ہوئے!
 میلِ دونوں کا عجب کارِ خدا ساز رہا!
 خانہ افروز ہے شعلہ مرے سینے میں مگر
 اک وہ شعلہ بھی ہے جو خانہ بر انداز رہا!
 تکیہ میں نے نہ کیا عقلِ فلاطوں پہ کبھی
 دل مرے پہلو میں شوخ اور نظر باز رہا!



این جهان چیست؟ صنم خانه پندارِ من است!
 جلوه او گرو دیده بیدارِ من است!
 همه آفاق که گیرم بنگاه او را
 حلقه هست که از گردش پرکارِ من است
 هستی و نیستی از دیدن و نادیدنِ من
 چه زمان و چه مکان، شوخی افکارِ من است!
 از فسوں کاری دل، سیر و سکون، غیب و حضور!
 این که غماز و کشائنده اسرارِ من است
 آن جهانے که درو کاشته را می دروند
 نور و نارش همه از سجه و زنارِ من است
 سازِ تقدیرم و صد نغمه پنهان دارم
 هر کجا زخمه اندیشه رسد تارِ من است

اے من از فیض تو پاینده! نشان تو کجا است؟
 این دو گیتی اثرِ ماست جهان تو کجا است؟

جہاں کیا ہے صنمخانہ ہے میرے ہی خیالوں کا!
 مرا ہی دیدہ بیدار، منبع آس کے جلووں کا!
 جہاں چار سو جس پر ہے حاوی اک نگہ میری
 یہ حلقہ ہے مرے پرکار کی گردش کے نقطوں کا
 جو دیکھوں میں تو ہستی ہے، نہ دیکھوں تو عدم ہر شے
 زماں ہو یا مکاں ہو، نقش ہے میری ہی سوچوں کا
 حضور و غیب ہو، سیر و سکون ہو، دل کا جادو ہے
 یہ ہے کاشف، یہ ہے غماز، میرے سارے بھیدوں کا
 وہ عالم جس میں اپنا بویا، کاٹا جائے گا آخر
 ہے نور و نار میں آس کے اثر میرے طریقوں کا
 میں ہوں تقدیر کا وہ ساز جس میں نغمے پنہاں ہیں
 جہاں ہو فکر کا زخمہ، وہیں سر میرے تاروں کا
 ہوں تیرے فیض سے پابندہ، مل جائے نشان تیرا
 یہ دو عالم ہمارے ہیں، کہاں ڈھونڈیں جہاں تیرا؟

فصلِ بہارِ این چنیں بانگِ ہزارِ این چنیں
 چہرہ کشا ، غزلِ سراءِ بادہ بیارِ این چنیں
 اشکِ چکیدہ ام بہ ہیں ہم بہ نگاہِ خود نگر
 ریز بہ نیستانِ من برق و شرارِ این چنیں
 بادِ بہارِ را بگو ، بے بخیالِ من برد
 وادی و دشت را دہد نقش و نگارِ این چنیں
 زادہٗ باغ و راغ را از نفسم طراوتے
 در چمنِ تو زیستم با گل و خارِ این چنیں
 عالمِ آب و خاک بر محکِ دلم بسائے
 روشن و تاریِ خویش را گیر عیارِ این چنیں
 دل بکسے نباختہ با دو جہاں نساختہ!
 من بحضورِ تو رسم ، روزِ شمارِ این چنیں
 فاختہٗ کہنِ صغیرِ نالہٗ من شنید و گفت
 کس نہ سرود در چمنِ نغمہٗ پارِ این چنیں



فصلِ بہار اس طرح ، بانگِ ہزار اس طرح
 چہرہ دکھا ، غزل سنا ، مرے کو نکھار اس طرح
 ٹپکے ہیں اشک جو مرے ، آن پہ تری نگاہ ہو
 میرے نیستان میں گرا ، برق و شرار اس طرح
 بادِ بہار سے کہو ، ہو مری پیرو خیال
 وادی و دشت کو ملے نقش و نگار اس طرح
 تازہ مرے نفس سے ہیں زادہٗ باغ و راغ سب
 تیرے چمن میں میں رہا ، با گل و خار اس طرح
 دل کو مرے محک بنا ، عالمِ آب و خاک کی
 تیرے سیہ سفید کا یہ ہو عیار اس طرح
 ہو مرا قلبِ خود نگر ، دونوں جہاں سے بے نیاز
 آؤں ترے حضور میں روزِ شمار اس طرح
 میری صدا پہ بول اٹھی نغمہ شناسِ فاختہ
 ہم نے سنا نہیں کبھی نغمہٗ پار اس طرح

برون کشید ز پیچاکِ هست و بود مرا
 چه عقده‌ها که مقامِ رضا کشود مرا

تپید عشق و درین کشتِ نابسامان
 هزار دانه فرو کرد تا درود مرا

ندانم این که نگاهش چه دید در خاکم
 نفس نفس بعیارِ زمانه سود مرا

جهان از خس و خاشاک در میان انداخت
 شرارهٔ دلکے داد و آزمود مرا

پیاله گیر ز دستم که رفت کار از دست
 کرشمه بازی ساقی ز من ربود مرا!



کر دیا ہست و بود کے مخمصوں سے رہا مجھے
عقدوں کا حل سجھا گیا مرتبہؑ رضا مجھے

دائے ہزار عشق نے بوئے اس ارضِ زار میں
ہونے لگی درو جو فصلؑ، پایا فقط بپا مجھے

دیکھا نہ جانے آس نے کیا میری ہی مشتِ خاک میں
ہر دم زمانہ کا عیار آس نے بنا لیا مجھے

لا کے جہانِ خار و خس رکھ دیا میرے سامنے
دے کے شرارِ دل کیا حوصلہ آزما مجھے

جام کو میرے ہاتھ سے لئے لو کہ یارو میں چلا
ساقیؑ فتنہ کار نے مجھ سے کیا جدا مجھے



خیز و بخاکِ تشنه ، باده زندگی فشان
آتشِ خود بلند کن آتشِ ما فرو نشان

میکده تہی سبو حلقہ خود فرامشان
مدرسه بلند بانگ بزمِ فسرده آتشان

فکرِ گرہ کشا ، غلام ، دین بروائتے تمام
زانکہ درونِ سینه ها دل هدفے است بے نشان

هر دو بمنزلے روان هر دو امیرِ کاروان
عقل بحیاه می برد ، عشق برد کشان کشان

عشق ز پا در آورد خیمہ شش جہات را
دست دراز می کند تا بہ طنابِ کہکشان



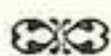
پیاسی ہے خاک، آ اسے بادۂ زندگی پلا
اپنی لگی کو تیز کر، میری لگی کو بھی بچھا

حلقہٴ خود فرامشاں خالی سبو پہ مست ہے
ایک فسرده آگ ہے مدرسہ بازِ خودستا

سینوں میں دل ہے وہ ہدف جس پہ نشاں نہیں کوئی
دیں ہے روایتِ کہن، فکرِ غلامِ بستہ پا

دونو ہیں میرِ کارواں، منزل مگر جدا جدا
عشق کشاں کشاں رواں، عقل بچیلہ رہنا

کر دیا عشق نے نگوں خیمہٴ شش جہات کو
دامنِ کہکشاں پہ آج ہاتھ ہے آس کا پڑ گیا



تو باین گہاں کہ شاید سرِ آستانہ دارم
بطوافِ خانہ کارے بخدائے خانہ دارم

شررِ پریدہ رنگم ، مگدر ز جلوۂ من
کہ بتابِ یک دوا آنے تبِ جاودانہ دارم

نکنم دگر نگاہے بہ رہے کہ طے نمودم
بسراغِ صبحِ فردا روشِ زمانہ دارم

یم عشق کشتی من ، یم عشق ساحلِ من
نہ غم سفینہ دارم ، نہ سرِ کرانہ دارم

شررے فشاں و لیکن شررے کہ وا نسوزد
کہ ہنوز نو نیازم غم آشیانہ دارم!

باُمیدِ این کہ روزے بشکار خواہی آمد
ز کمندِ شہریاراں رم آہوانہ دارم

نو اگر کرم نمائی بمعاشراں بہ بخشم
دو سہ جام دلفروزے ز مے شبانہ دارم

تجھے یہ گماں کہ مجھ کو ہے تلاشِ آستانہ
 ہے طوافِ اس غرض سے کہ ملے خدا کے خانہ

گو میں رنگ اڑا شرر ہوں، مرا جلوہ دیدنی ہے
 مری تاب اک دو لحظہ میں تپش ہے جاودانہ

جو گزر چکی وہ منزل نہیں دیکھتا پلٹ کر
 میں سراغِ صبحِ فردا میں ہوں پیروِ زمانہ

یم عشقِ میری کشتی، یم عشقِ میرا ساحل
 نہ غمِ سفینہ مجھ کو نہ ہے خواہشِ کرانہ

وہ شرر عطا ہو مجھ کو جو نہ پھونک ڈالے ہر شے
 میں ہوں نو نیاز، ابھی ہے مجھے فکرِ آشیانہ!

اس امید پہ کہ اک دن تو نے شکار آئے
 میں کمنڈِ شہرِ یاراں سے ہوں رَم میں آہوانہ

ہو کرم، معاصروں کو میں عطا کروں وہ ساغر
 جو بچے ہیں پاس میرے پسِ محفلِ شبانہ

نظر به راه نشینان سواره می گزرد
مرا بگیر که کارم ز چاره می گزرد

به دیگران چه سخن گسترم ز جلوۀ دوست
به یک نگاه مثال شراره می گزرد

رهِ بمنزلِ آن ماه سخت دشوار است

چنان که عشق بدوش ستاره می گزرد

ز پرده بندی گردون چه جائی نو میدی است

که ناوکِ نظرِ ما ز خارهِ می گزرد

مے است شبم ما ، که کشان کناره اوست

بیک شکستنِ موج از کناره می گزرد

مخلوتش چو رسیدی نظر باو مکشا

که آن دمے ست که کار از نظاره می گزرد

من از فراق چه نالم که از هجویم سرشک

ز راه دیده دلم پاره پاره می گزرد

نظر میں راہ نشیں ہیں ، سوار گزرا ہے
مجھے سنبھال کہ چارے سے کار گزرا ہے

بیاں ہو جلوہٴ محبوب کا ، تو کیسے ہو
نگاہ کی تو مثالِ شرارِ گزرا ہے

کٹھن ہے اس قدر آس ماہ کی رہِ منزل
جو عشقِ گزرا تو اخترِ سوار گزرا ہے

فلک کے پردے مجھے ناامید کیسے کریں
کہ میرا تیرِ نظرِ سل کے پار گزرا ہے

ہے اپنی اوس سمندر ، کنارِ کہکشاں اس کا
اٹھی جو موج ، برونِ کنارِ گزرا ہے

نصیبِ آس کی ہو خلوت تو رکھ نظر نیچی
کہ کارِ عشقِ نظارے کے پار گزرا ہے

فغاںِ فراق میں کر لوں ، پہ کیا کروں دل کا
براہِ دیدہ یہ اب تار تار گزرا ہے

بر عقلِ فلک پیما ترکانہ شبیخون بہ
 یک ذرہ دردِ دل از علمِ فلاطون بہ
 دی 'مغ پچہ' با من اسرارِ محبت گفت
 اشکے کہ فرو خوردی از بادہ گلگون بہ
 آن فقر کہ بے تیغے صد کشورِ دل گیرد
 از شوکتِ دارا بہ ، از فرِ فریدون بہ
 در دیرِ مغان آئی مضمونِ بلند آور
 در خانقہ صوفی افسانہ و افسوں بہ
 در جوئے روانِ ما ، بے منتِ طوفانے
 یک موج اگر خیزد آن موج ز جیحوں بہ
 سیلے کہ تو آوردی در شہر نمی گنجد
 این خانہ بر اندازے در خلوتِ ہا مون بہ
 اقبالِ غزلِ خواں را کافر نتوان گفتن
 سودا بدماغش زد از مدرسہ بیرون بہ

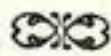
فلک رس عقل کو کر بس میں، بے باکانہ شبخوں سے
 ہے دردِ دل کا اک ذرہ سوا علم فلاطوں سے
 یہ کھولے مجھ پہ اسرارِ محبت مُغِ بچے نے کل
 جو آنسو پی لیا تو نے، وہ بہتر جامِ گلاگون سے
 دلوں کے جو کرے تسخیرِ کشور، فقرِ بے شمشیر
 وہ بہتر شوکتِ دارا سے اور فرِ فریدوں سے
 اگر دیرِ مغان میں آئے، مضمون چاہیے عالی
 حضورِ صوفی کیا بہتر فسانے اور افسوں سے
 اٹھے اک موجِ میری جو میں گر بے منتِ طوفان
 سوا خوبی میں وہ موجِ یگانہ رودِ جیحوں سے
 سمائے شہر میں کیسے یہ تیرا سیلِ بے پایاں
 بنے گی خانہ برانداز کی تو دشت و هاموں سے
 نہیں اچھا کہ اقبالِ غزلِ خوان کو کہیں کافر
 یہ بہتر ہے رہے ہر مدرسہ دور ایسے مجنوں سے

یا مسلمان را مدہ فرماں کہ جان بر کف بنہ
 یا دریں فرسودہ پیکر تازہ جانے آفریں
 یا چناں کن یا چنیں!

یا برہمن را بفرما نوّ خداوندے تراش
 یا خود اندر سینہ زناریاں خلوت گزین
 یا چناں کن یا چنیں!

یا دگر آدم کہ از ابلیس باشد کمترک
 یا دگر ابلیس بہر امتحانِ عقل و دین
 یا چناں کن یا چنیں!

یا جہانے تازہ یا امتحانے تازہ
 می کنی تا چند با ما آنچه کر دی پیش ازین
 یا چناں کن یا چنیں!

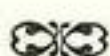


یا مسلمان سے نہ فرما جاں ہتھیلی پر رکھے
جانِ تازہ یا ہو اس فرسودہ پیکر کو عطا
فیصلہ کراے خدا!

برہمن کو حکم دے، تازہ تراشے دیوتا
سینہ زناریاں میں یا خود اپنا گھر بنا
فیصلہ کراے خدا!

یا نیا آدم کہ جو ابلیس سے کم تر ہے
یا نیا ابلیس عقل و دین کا ہو ظرف آزما
فیصلہ کراے خدا!

یا کوئی تازہ جہاں ہو یا نیا ہو امتحان
کب تک اس کا ہی اعادہ جو ہے پہلے ہو چکا
فیصلہ کراے خدا!



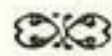
فقیر بخشہ؟ با شکوہِ خسروِ پرویز بخش
یا عطا فرما خرد با فطرتِ روح الامیں
یا چنان کن یا چنیں!

یا بکُش در سینہء من آرزوئے انقلاب
یا دگرگوں کن نہادِ این زمان و این زمیں
یا چنان کن یا چنیں!



فقر دے تو ساتھ دے اُس کے شکوہ خسروی
یا خرد اور فطرتِ روح الامیں کر دے عطا
فیصلہ کر اے خدا!

یا بجھا دے میرے دل میں آرزوے انقلاب
یا بدل دے تیری قدرتِ فطرتِ ارض و سما
فیصلہ کر اے خدا!

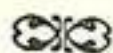


عقل هم عشق است و از ذوقِ نگه بیگانه نیست
لیکن این بیچاره را آن جرأتِ رندانه نیست

گرچه می دانم خیالِ منزلِ ایجادِ من است
در سفر از پا نشستنِ همتِ مردانه نیست

هر زمان یک تازه جولانگاه می خواهم ازو
تا جنون فرماید من گوید دگر ویرانه نیست

با چنین زورِ جنونِ پاسِ گریبان داشتم
در جنون از خود نرفتن کارِ هر دیوانه نیست

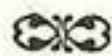


عقل بھی ہے عشق ، بینائی سے بیگانہ نہیں
لیکن اس بیچاری میں جرأت وہ رندانہ نہیں

جاننا ہوں ، ہے آپج میری ، یہ منزل کا خیال
چھوڑنا تھک کے سفر ، اندازِ مردانہ نہیں

ہر نفس اک تازہ جولانگاہ کرتا ہوں طلب
وہ نہ جب تک خود کہے اب کوئی ویرانہ نہیں

اس جنوں میں بھی مجھے پاسِ گریباں ہی رہا
اس طرح کا خود نگر ہر کوئی دیوانہ نہیں



سوز و گدازِ زندگی لذتِ جستجوئے تو
 راہ چو مار می گزد گر نروم بسوئے تو

سینہ کشادہ جبرئیل از برِ عاشقان گزشت
 تا شررے باو فتد ز آتشِ آرزوئے تو

ہم بہوائے جلوہٴ پارہ کنم حجاب را
 ہم بنگاہِ نارسا پردہ کشم بروئے تو

من بتلاشِ تو روم یا بتلاشِ خود روم
 عقل و دل و نظر ہمہ گم شدگانِ کوئے تو

از چمنِ تو رستہ ام قطرہٴ شبنمے بہ بخش
 خاطر غنچہ وا شود کم نشود ز جوئے تو



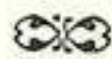
سوز و گدازِ زندگی ، لذتِ جستجو تری
 ڈستی ہے راہِ گر نہ ہو ، رہ مرے رو برو تری

سینہ کشادہ جبرئیل گزرا قرینِ عاشقان
 تا آسے بخشے اک شررِ آتشِ آرزو تری

جلوے کی آرزو سے میں کرتا ہوں پارہ یہ حجاب
 پر یہ نگاہِ نارسا ، خود ہے نقابِ رو تری

نکلوں تری تلاش میں یا کروں اپنی جستجو
 عقل و دل و نظر مرے ہو گئے نذرِ کو تری

تیرے چمن کا پھول ہوں ، قطرہ عطا ہو اوس کا
 من کی کلی کھلے تو کیا ہو گی کم آبِ جو تری



دریں محفل کہ کارِ او گزشت از بادہ و ساقی
ندیمے کو کہ در جامش فروریزم مے، باقی!

کسے کوزہرِ شیریں می خورد از جام زرینے
مے تلخ از سفالِ من کجا گیرد بہ تریاقی

شرار از خاکِ من خیزد، کجا ریزم، کراسوزم
غلط کردی کہ در جانم فگندی سوزِ مشتاقی

مکدر کرد مغرب چشمہ ہائے علم و عرفان را
جہاں را تیرہ تر سازد چہ مشائی چہ اشراقی

دلِ گیتی! انا المسموم، انا المسموم، فریادش
خرد نالان کہ ما عندی بتریاق ولا راقی

چہ ملائی چہ درویشی، چہ سلطانی، چہ دربانی
فروغِ کار می جوید بسالوسی و زراقی

ببازارے کہ چشم صیرفی شوراست و کم نوراست
نگینم خوار تر گردد چو افزایش بہ برّاقی

نہیں محفل کو کافی اہتمام بادہ و ساقی
 کہاں ساتھی کہ جس کے جام میں بھر دوں مے باقی!
 وہ جس نے پی لیا ہو زہر شیریں جام زریں سے
 مری تلخِ سفالی سے ہو کیسے آس کی تریاقی
 مرے تن سے شرر اٹھے، کہاں پھینکوں، کسے سونپوں
 مری جاں کو دیا کیوں تو نے آخر سوزِ مشتاقی!
 مکدر کر دیے مغرب نے چشمے علم و عرفاں کے
 جہاں تاریک تر اس سے ہو مشائی (۱) کہ اشراقی (۲)
 دلِ گیتی ہے فریادی، مجھے اس زہر نے مارا
 خرد بولی، نہیں بس میں مرے تریاق اور راقی (۳)
 ہو 'ملائی کہ درویشی، ہو سلطانی کہ دربانی
 فروغِ کار میں آس کے فریب و مکر و زراقی
 جہاں بازار کے ناقد کی آنکھیں زار و کم ہیں ہوں
 نگیں اتنا ہی میرا خوار، جتنی آس کی براقی

(۱) ، (۲) - فلسفہ کے دو دبستان - مشائیت - اشراقیت
 (۳) ساحر یا فسوں گر

ساقیا بر جگرم شعلهٔ نمناک انداز
 دگر آشوبِ قیامت بکفِ خاک انداز
 او بیک دانهٔ گندم بزمینم انداخت
 تو بیک 'جرعه' آب آنسوئے افلاک انداز
 عشق را بادهٔ مرد افکن و پُر زور بده
 لای این باده به پیمانۂ ادراک انداز
 حکمت و فلسفه کرد است گراں خیز مرا
 خضرِ من! از سرم این بارِ گراں پاک انداز
 خرد از گرمیِ صہبا بگدازے نرسید
 چارۂ کاربآں غمزۂ چالاک انداز
 بزم در کشمکشِ بیم و امید است هنوز
 همه را بے خبر از گردشِ افلاک انداز
 می توان ریخت در آغوشِ خزاں لاله و گل
 خیز و بر شاخِ کہن خونِ رگِ تاک انداز

پھر جگر پر مرے اک شعلہٴ نمناک گرے
 ساقی! آشوبِ قیامت بکفِ خاک گرے
 آس نے اک دانہ کے بدلے میں زمیں پر پھینکا
 دے وہ جرعه کہ یہ بندہ سرِ افلاک گرے
 عشق کو دے مرے مرد افگن و تند و پُر زور
 جو بھی تلچھٹ ہو، بہ پیمانہٴ ادراک گرے
 حکمت و فلسفہ نے مجھ کو گراں خیز کیا
 خضرِ من! بار مرے سر سے سرِ خاک گرے
 پا سکی عقل نہ کچھ گرمیِ بادہ سے گداز
 بجلی بن کر وہ ترا غمزہٴ چالاک گرے
 بزم میں بیم و رجا کی ہیں ابھی تک گھاتیں
 اب نہ اس پر اثرِ گردشِ افلاک گرے
 ہو تو سکتے ہیں گل و لالہ خزاں میں پیدا
 شاخ کہنہ پہ اگر خونِ رگِ تاک گرے

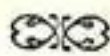
از آن آئے کہ در من لاله کارد ساتگینے ده
کفِ خاکِ مرا ساقی ببادِ فرودینے ده

زمینائے، که خوردم در فرنگ اندیشه تاریک است
سفر ورزیده خود را نگاهِ راه بینے ده

چو خس از موجِ هر بادے که می آید ز جا رفتم
دلِ من از گمانها در خروش آمد یقینے ده

بجام آرزوها بود و نابودِ شرر دارد
شبنم را کوکبے از آرزوے دل نشینے ده

بدستم خامه دادی که نقشِ خسروی بندد
رقم کش این چنینم کرده لوحِ جبینے ده



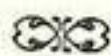
آسی صہبہا کا ساغر ہو جو دل کو لالہ کاری دے
اڑا لے جائے میری خاک ، وہ بادِ بہاری دے

جو پی اقلیم مغرب میں ہوا تاریک فکر اس سے
نگہ دے اپنے راہی کو ، سفر سے سازگاری دے

اڑاتا ہے ہر اک جھونکا ہوا کا مثلِ خس مجھ کو
پریشاں ہوں گمانوں سے ، یقینِ شبہوں سے عاری دے

شرر صورت تمنائیں مرے دل سے گزرتی ہیں
مری شب کی جو کوکب ہو ، تو آس کو پایداری دے

دیا ہے مجھ کو وہ خامہ جو نقشِ خسروی کہینچے
کوئی لوحِ جبیں بھی اب برائے نقشِ کاری دے



ز ہر نقشے کہ دل از دیدہ گیرد پاک می آیم
گدائے معنی پاکم تہی ادراک می آیم

گہے رسم و رہ۔ فرزانگی ذوقِ جنوں بخشد
من از درسِ خرد منداں گریباں چاک می آیم!

گہے پیچد جہاں بر من گہے من بر جہاں پیچم
بگرداں بادہ تا بیرون ازین پیچاک می آیم

نہ این جا چشمکِ ساقی نہ آنجا حرفِ مشتاقی
ز بزمِ صوفی و مُلا بسے غمناک می آیم

رسد وقتی کہ خاصانِ ترا با من فتد کارے
کہ من صحرائیم پیشِ ملک بے باک می آیم



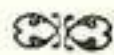
مٹایا نقش جو بھی آنکھ سے دل نے کبھی پایا
گدا ہوں پاک معنی کا ، تہی ادراک میں آیا

کبھی ذوق جنوں اہلِ خرد کی دین ہوتا ہے
میں درسِ اہلِ دانش سے گریباں چاک کر لایا

کبھی مجھ سے جہاں لپٹا ، جہاں سے میں کبھی لپٹا
میں اس چکر سے نکلوں گا جو بادہ دور میں آیا

نہیں یاں چشمکِ ساقی ، نہیں واں حرفِ مشتاقی
مرا غم محفلِ صوفی و مُملا نے ہے بھڑکایا

وہ وقت آئے گا ، تیرے خاص بندے مجھ کو ڈھونڈیں گے
کہ میں پیشِ ملک نے باک ہوں ، صحرا کا ہوں جایا



دلِ بے قیدِ من با نورِ ایمان کافری کرده
 حرم را سجدہ آورده بتاں را چاکری کرده
 متاعِ طاعتِ خود را ترازوئے برافرازد
 بیازارِ قیامت با خدا سوداگری کرده
 زمین و آسمان را بر مرادِ خویش می خواهد
 غبارِ راه و با تقدیرِ یزداں داوری کرده
 گہے با حق درآمیزد ، گہے با حق درآویزد
 زمانے حیدری کرده ، زمانے خیبری کرده
 بایں بے رنگی جوهر ازو نیرنگ می ریزد
 کلیمے بیں کہ ہم پیغمبری ہم ساحری کرده
 نگاہش عقلِ دور اندیش را ذوقِ جنون دادہ
 و لیکن با جنونِ فتنہ سامان نشتری کرده
 بخود کے می رسد این راہ پیمائے تن آسانے
 ہزاراں سال منزل در مقام آذری کردہ!

مرا بے قید دل مومن ہے ، اس نے کافری کی ہے
حرم میں سجدہ ریزی کی ، بتوں کی چاکری کی ہے

متاعِ بندگی لے کر ، بپا میزاں کیا اس نے
خدا سے حشر کے بازار میں سوداگری کی ہے

زمین و آسماں ہوں سازگار ، اس کی تمنا ہے
غبارِ راہ نے تقدیرِ حق سے داوری کی ہے

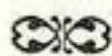
کبھی ہے حق سے مل بیٹھا ، کبھی حق سے الچھ بیٹھا
اسی نے حیدری کی ہے ، اسی نے خیبری کی ہے

یہ ہے بے رنگ جوہر میں ، پہ نیرنگی کا خالق ہے
کلیم ایسا ، پیمبر ہو کے جس نے ساحری کی ہے

فلک رس عقل کو اس کی نظر ذوقِ جنوں بخشے
جنوںِ فتنہ ساماں کی بھی اس نے نشتری کی ہے

یہ تن آساں ہے راہی ، کیسے اپنے آپ تک پہنچے
ہزاروں سال تک اس نے مسلسل آذری کی ہے

زِ شاعرِ نالهٔ مستانه در محشر چه می خواهی
 تو خود هنگامهٔ ، هنگامهٔ دیگر چه می خواهی
 به بحرِ نغمه کردی آشنا طبعِ روانم را
 ز چاکِ سینه ام دریا طلب ، گوهر چه می خواهی
 نمازِ بے حضور از من نمی آید ، نمی آید
 دلے آورده ام دیگر ارین کافر چه می خواهی



فغانِ مستانہ شاعر سے ، سرِ محشر تو کیوں چاہے
تو خود ہنگامہ ہے ، ہنگامہ دیگر تو کیوں چاہے

مری طبعِ رواں کو بحرِ نغمہ کا کیا محرم
مرے سینہ سے کر دریا طلب ، گوہر تو کیوں چاہے

نمازِ بے حضور اور میں ! یہ کیسے ہو ، یہ کیسے ہو !
یہ کافر ، دل تو لایا ہے ، دگر محضر تو کیوں چاہے

نہ در اندیشہٴ من کارزارِ کفر و ایمانے
 نہ در جانِ غم اندوزم، ہوائے باغِ رضوانے

اگر کاوی درونم را خیالِ خویش را یابی
 پریشانِ جلوہٴ چوں ماہتاب اندر بیابانے!





نہ میرے فکر کے میدان میں جنگِ کفر و ایمان ہے
نہ دل کے غم کدہ میں آرزوے باغِ رضواں ہے

مرا دل جو کریدو گے ، خیال اپنا ہی پاؤ گے
پریشاں جلوہ جیسے چاندنی ہے اور بیاباں ہے



مرغِ خوش لہجہ و شاہینِ شکاری از تست
 زندگی را روشِ نوری و ناری از تست
 دلِ بیدار و کفِ خاک و تماشائے جہاں
 سیرِ این ماہ بشبِ گونه عماری از تست
 ہمہ افکارِ من از تست چہ در دل چہ بلب
 گہز از بحرِ برآری نہ برآری از تست
 من ہماں مشتِ غبارم کہ بجائے نرسد
 لالہ از تست و نمِ ابر بہاری از تست
 نقشِ پرداز توئی ما قلمِ افشا نیم
 حاضر آرائی و آیندہ نگاری از تست
 گلہ ہا داشتم از دل بزبانم نرسید
 مہرونے مہری و عیاری و یاری از تست

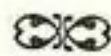
مرغِ خوش امجہ و شاہینِ شکاری تیرے
جینے کے ڈھنگ سبھی نوری و ناری تیرے

خاک کا پتلا ، دلِ زندہ ، تماشائے جہاں
سیر اس ماہ کی ، شبِ رنگِ عماری تیرے
تیرے ہیں ، دل میں کہ لب پر ہوں ، سب افکار مرے
ہوں گہرِ بحر میں یا بر میں ہوں ساری ، تیرے

میں وہی دھول کہ آوارہ رہی راہوں میں
گلِ لالہ و نمِ ابرِ بہاری تیرے

نقشِ پرداز ہے تو ، ہم قلمِ افشاں ہیں
زینتِ امروز کی اور فردا نگاری تیرے

دل سے شکوے تھے کئی ، لب پہ نہ آئے لیکن
مہر و لے مہری و عیاری و یاری تیرے



خوشتر ز هزار پارسائی
گامے بطریقِ آشنائی

در سینہٴ من دمے بیاساے
از محنت و کلفتِ جدائی

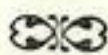
مارا ز مقامِ ما خبر کن
مائیم کجاؤ تو کجائی؟

آن چشمکِ محرمانہ یاد آر
تا کے بتغافل آزمائی

دی ماہِ تمامِ گفت با من
در سازِ بداغِ نارسائی

خوش گفت ولے حرام کردند
در مذهبِ عاشقانِ جدائی

پیشِ تو نہادہ ام دلِ خویش
شاید کہ تو این گرہ کشائی!



خوب تر ہے ہزار پارسائی سے
اک قدم بھی طریقِ آشنائی سے

میرے سینے میں آکے دم ذرا لے لو
لگی ہیں کلفتیں بہت خدائی سے

ہم کو اپنے مقام کی خبر تو دے
کتنے ہم ہیں پرے تری رسائی سے

پھر وہی تیری محرمانہ چشمک ہو
کام کب تک تغافل آزمائی سے

میرے ماہِ تمام نے کل یہ کہا
ہو نہ دل تنگ داغِ نارسائی سے

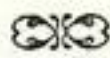
بات تو خوب کی ہے مگر ہے حرام
عاشقوں کو مصالحتِ جدائی سے

میں نے دل کھول کر تجھے دکھایا ہے
حل ہو مشکل، تری گرہ کشائی سے

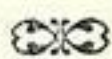


بر جهانِ دلِ من تاختنش را نگرید
 کشتن و سوختن و ساختنش را نگرید
 روشن از پر توِ آن ماهِ دلِ نیست که نیست
 با هزار آئینه پرداختنش را نگرید
 آنکه یکدست برد ملکِ سلیمانِ چند
 با فقیرانِ دو جهانِ باختنش را نگرید
 آنکه شبخون بدل و دیدهٔ دانایان ریخت
 پیشِ نادان سپر انداختنش را نگرید

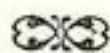
کرتا دل پر ترکتازی کیسے آیا ، دیکھیے
 خود ہی مارا ، خود جلایا ، خود جلایا دیکھیے
 اس مہِ کامل کا پرتو کون سے دل پر نہیں
 ہے ہزار آئینوں میں محوِ تماشا دیکھیے
 جس نے سو ماہکِ سلیمان سر کیے اک وار میں
 اک گدا کو دو جہاں دے بے تقاضا دیکھیے
 مارے شبخوں جس نے داناؤں کی چشم و قلب پر
 ایک ناداں سے وہ ہارے ، یہ اچنبھا دیکھیے



مرا براهِ طلبِ بار در گل است هنوز
 که دل بقافله و رخت و منزل است هنوز
 کجاست برقِ نگاهِ که خانمان سوزد!
 مرا معامله با کشت و حاصل است هنوز
 یکسے سفینہٴ این خام را بطوفانِ ده
 ز ترسِ موجِ نگاهم بساحل است هنوز
 تپیدن و ترسیدن چه عالمے دارد
 خوشا کسے کہ بدنبالِ محمل است هنوز
 کسی کہ از دو جہاں خویش را بروں شناخت
 فریب خوردهٴ این نقشِ باطل است هنوز
 نگاهِ شوقِ تسلی بجلوہٴ نشود
 کجا برم خلشے را کہ در دل است هنوز
 حضورِ یارِ حکایتِ درازتر گردید
 چنانکہ این همه ناگفتہ در دل است هنوز



ابھی راہ طلب میں ہے مرا بارِ سفر، گل میں
 کہ اب تک ہے مرا دل قافلہ و رخت و منزل میں
 کہاں ہیں وہ نظر کی بجلیاں جو خانماں پھونکیں
 مرا سب کام الجھا ہے ابھی تک کشت و حاصل میں
 ذرا مجھ خام کی کشتی کو طوفاں آشنا کر دے
 کہ خوفِ موج سے میری نظر اٹکی ہے ساحل میں
 تپش ہو، نارسائی ہو، اسی میں ایک عالم ہے
 وہی خوش بخت ہے جو رواں دنبالِ محمل میں
 دو عالم سے پرے جس نے نہ اپنے آپ کو جانا
 گھری ہے اس کی ذات اب تک فریبِ نقشِ باطل میں
 نگاہِ شوق کی تسکین کو اک جلوہ نہیں کافی
 خلش کا کیا کروں جو ہے نہاں اب تک مرے دل میں!
 حکایت ہو گئی لمبی حضورِ یار کچھ ایسے
 کہ جو کہنے کی باتیں تھیں، ہی نا گفتمہ ابھی دل میں!



زمستان را سرآمد روزگاران
نواها زنده شد در شاخساران

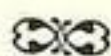
گلان را رنگ و نم بخشد هواها
که می آید ز طرفِ جوئباران

چراغِ لاله اندر دشت و صحرا
شود روشن تر از بادِ بهاران

دلِ افسرده تر در صحبتِ گل
گریزد این غزال از مرغزاران!

دمه آسوده با درد و غم خویش
دمه نالان چو جوئے کمپساران

ز بیم اینکه ذوقش کم نگردد
نگویم حالِ دل با رازداران!



زمستان کا سماں بدلا بہاروں سے
 نوائیں جاگ اٹھی ہیں شاخساروں سے
 گلوں کو رنگ و نم بخشا ہواؤں نے
 جو آئی ہیں لمہکتی جوئیٹباروں سے

چراغِ لالہ صحرا میں بھڑک اٹھے
 نسیم آئی لیے سندیسہ یاروں سے
 مرا دل صحبتِ گل میں فسرده تر
 گریزاں ہے یہ آہو مرغزاروں سے

ابھی پہلو میں درد و غم کے آسودہ
 ابھی نالاں ہے مل کر آبشاروں سے
 مبادا ذوق اس کا ہو نہ جائے کم
 چھپایا حالِ دل ہے رازداروں سے

هو اے خانہ و منزل ندارم
سرِ راہم غریبِ ہر دیارم

سحر می گفت خاکستر صا را
«فسرد از بادِ این صحرا شرارم

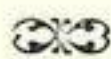
گزر نرمک پریشانم مگرداں
ز سوزِ کاروانے یاد گارم»

ز چشمم اشک چون شبم فروریخت
کہ من ہم خاکم و در رہگزارم!

بگوشِ من رسید از دل سرودے
کہ جوے روزگار از چشمہ سارم

ازل تاب و تبِ پیشینہٴ من
ابد از ذوق و شوقِ انتظارم

میندیش از کفِ خاکے میندیش
بجانِ تو کہ من پایاں ندارم!



منزل سے کچھ غرض ہے نہ مشتاقِ دار* ہوں
 راہی ہوں ہر کہیں میں غریب الدیار ہوں
 کہتی تھی راکھ باد صبا سے یہ صبح دم
 »اس دشت کی ہوا سے فسردہ شرار ہوں

آہستہ کر خرام، پریشاں نہ کر مجھے
 اک کارواں کے سوز کی میں یادگار ہوں»

شبِ نم کی طرح ٹپکے ہیں آنکھوں سے میرے اشک
 مشتِ غبار ہوں میں سرِ رہگزار ہوں!

آئی ہے میرے کان میں گاتی صدائے دل
 جو اصلِ جُوئے دھر ہے، وہ چشمہ سار ہوں

ماضی میں میری ہی تو تڑپ کا ازل ہے نام
 ہے یہ ابد کہ میں سراسر انتظار ہوں

کر مشتِ خاک کی نہ کوئی فکر زینہار
 مجھ کو تری قسم ہے کہ میں بے کنار ہوں!

* دار بمعنی گھر

از چشمِ ساقی مستِ شرابم
بے مے خرابم، بے مے خرابم

شوقم فزوں تر از بے حجابی
بینم نہ بینم در پیچ و تاجم

چوں رشته شمع آتش بگیرد
از زخمه من تار ربام!

از من بروں نیست مترلگه من
من بے نصییم رایے نیام!

تا آفتابے خیزد ز خاور
مانندِ انجم بستند خوابم!



بس اے چشمِ ساقی ہوا میں شرابی
یہ بے مے خرابی! یہ بے مے خرابی!

جو بے پردہ دیکھا بڑھا شوق میرا
میں دیکھوں نہ دیکھوں، وہی پیچ اوتابی

ہے جُوں رشتہ شمع، جل جل اٹھا ہے
مرے زخمہ سے میرا تارِ ربابی!

نہیں مجھ سے باہر کوئی میری منزل
مری بے نصیبی، نہیں راہِ یابی

نہ خورشید نکلیگا خاور سے جب تک
جُوں انجم رہیگی میری بستہ خوابی^۲!

۱- ادنیٰ تصرف کے ساتھ

۲- بستہ خوابی بمعنی بے خوابی

شبِ من سحر نمودی کہ بہ طلعتِ آفتابی
تو بطلعتِ آفتابی سزد این کہ بے حجابی

تو بدردِ من رسیدی بضمیرم آرمیدی
ز نگاہِ من رمیدی بچنیں گراں رکابی

تو عیارِ کم عیاراں تو قرارِ بے قراراں
تو دوائے دل فگاراں مگر این کہ دیریابی

غمِ عشق و لذتِ او اثرِ دو گونه دارد
گہے سوز و درد مندی گہے مستی و خرابی!

ز حکایتِ دلِ من تو بگو کہ خوب دانی
دلِ من کجا کہ او را بکنارِ من نیابی!

بجلالِ تو کہ در دل دگر آرزو ندارم
بجز این دعا کہ بخشی بکبوترانِ عقابی!

مری شب سحر ہے، چمکی تری طلعت آفتابی
ترے رخ پہ مہر طلعت سجی خوب نے حجابی

مرے درد کی دوا تو، مرے دل میں آ بسا تو
پہ چھپا نظر سے کیونکر لیے یہ گراں رکابی

تو عیارِ کم عیاراں، تو قرارِ بے قراراں
تو دوائے دلفگاراں، تو یہ کیسی دیریابی

غم عشق میں ہے لذت مگر اس کے رنگ دو ہیں
کبھی سوز و درد مندی کبھی مستی و خرابی!

تجھے علم ہے، بیان کر، مرے دل کی خود حکایت
مرے دل کی میرے پہلو میں نہ ہو گی دستیابی

بجلاں تو کہ دل میں یہی ایک آرزو ہے
کہ ملے کبوتروں کو ترے لطف سے عقابی!

دریں میخانہ اے ساقی ندارم محرمے دیگر
 کہ من شاید نخستین آدمم از عالمے دیگر!

دمے این پیکرِ فرسودہ را سازی کفِ خاکے
 فشانی آب و از خاک آتش انگیزی دمے دیگر!

بیار آن دولتِ بیدار و آن جامِ جہاں بیں را
 عجم را دادہ، ہنگامہٴ بزمِ جمے دیگر





نہیں ساقی نشان اس میکدہ میں ایک محرم کا
کہ میں شاید ہوں پہلا آدمی اک اور عالم کا!

کبھی اس کہنہ پیکر کو تو مشّتِ خاک کرتا ہے
کبھی مٹی ہے آتش خیز پا کر رس ترے نم کا!

بہم پھر دولتِ بیدار اور جامِ جہاں ہیں ہو
دیا ہے تو نے ہنگامہ عجم کو محفلِ جم کا



بہ جہانِ دردمنداں تو بگو چہ کار داری؟
تب و تابِ ما شناسی؟ دلِ بے قرار داری؟

چہ خبر ترا ز اشکے کہ فرو چکد ز چشمے
تو بہ برگِ گل ز شبنم درِ شاہوار داری!

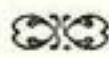
چہ بگویمت ز جانے کہ نفسِ نفسِ شمارد
دمِ مستعار داری؟ غمِ روزگار داری؟



یہ جہانِ درد منداں نہیں کاروبار تیرا
 نہیں تاب و تب کا محرم، دلِ بے قرار تیرا

تجھے کیا خبر کہ کیا ہے جو سرشک بن کے ٹپکا
 بنی برگِ گل پہ شبِ نیمِ در شاہوار تیرا!

کہوں حال کیا میں جاں کا، ہے نفس شمار ہر دم
 دمِ مستعار تیرا؟ غمِ روزگار تیرا؟



اگر نظارہ از خود رفتگی آرد حجاب اولیٰ
نگیرد با من این سودا بہا از بس گراں خواہی

سخن نے پردہ گوبا ما ، شد آن روز کم آمیزی
کہ می گفتند تو ما را چنیں خواہی چنان خواہی

نگاہ نے ادب زد رخنہ ہا در چرخ مینائی
دگر عالم بنا کن گر حجابے درمیاں خواہی

چنان خود را نگہ داری کہ با این نے نیازی ہا
شہادت بر وجود خود ز خونِ دوستان خواہی !

مقام بندگی دیگر ، مقام عاشقی دیگر
زنوری سجدہ می خواہی زخاکی بیش ازاں خواہی !

مسِ خامے کہ دارم از محبت کیمیا سازم
کہ فردا چوں رسم پیش تو از من ارمغان خواہی



جو لے خود کر دے نظارا تو جلوہ سے حجاب اچھا
نہیں کرتا میں یہ سودا کہ تو قیمت گراں چاہے

سخن کہہ ہم سے بے پردہ ، گیا دورِ کم آمیزی
جب اوروں سے تھے سنتے ، تو چنیں چاہے چناں چاہے

نگاہِ بے ادب سے چرخِ مینائی میں رخنے ہیں
نیا عالم بنا گر تو حجاب اک درمیاں چاہے

یہ تیری بے نیازی اور یہ تیری خود نگہداری
شہادت اپنے ہونے کی ، بخونِ دوستان چاہے!

مقامِ بندگی سے ہے مقامِ عاشقی برتر
تو چاہے سجدہ نوری سے مگر خاکی سے جاں چاہے!

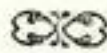
بنالونگا مسِ خام اپنا میں اکسیر الفت سے
کہ شاید مجھ سے تو روزِ قیامت ارمغان چاہے!

نورِ تو و انمود سپید و سیاه را
 دریا و کوه و دشت و در و مهر و ماه را!

تو در هوای آن که نگہ آشنائی اوست
 من در تلاشِ آن که نتابد نگاه را!

کاشف ہے تیرا نور ، سپید و سیاہ کا
 دریا و دشت و کوہ و در و مہر و ماہ کا

تو چاہتا ہے جس سے نگاہیں ہوں آشنا
 اور میں ، سہمے نہ بار جو تابِ نگاہ کا



بده آن که دل مستی هائے او از باده خویش است
بگیر این دل که از خود رفته و بیگانه اندیش است

بده آن دل بده آن دل که گیتی را فرا گیرد
بگیر این دل بگیر این دل که در بند کم و بیش است

مرا اے صید گیر از ترکشِ تقلیر بیروں کش
جگر دوزی چه می آید از آن تیرے که در کیش است!

نگردد زندگانی خسته از کارِ جہاں گیری
جہانے در گرہ بستم جہانے دیگرے پیش است!



وہ دل دے مستیوں میں جس کی جھلکے اپنی ہی صہبا
یہ دل کیا جو ہے بے خود اور فکرِ غیر کا شیدا

ملے وہ دل ، ملے وہ دل ، مستخر جو کرے گیتی
یہ دل لے لے ، یہ دل لے لے ، جو بیش و کم میں ہے الجھا

مجھے صیاد کھینچے ترکشِ تقلیر سے باہر
نہ اترے گا جگر میں تیر ، نہ ترکش سے گر نکلا!

نہیں کارِ جہانگیری سے ہوتی زندگی خستہ
جو کی تسخیر یہ دنیا ، ابھی ہے دوسری دنیا!



کفِ خاکِ برگ و سازم برپے فشانم او را
بامیدِ این کہ روزے بفلک رسانم او را

چہ کنم چہ چارہ گیرم کہ ز شاخِ علم و دانش
نہ دمیدہ ہیچ خارے کہ بدل نشانم او را

دہد آتشِ جدائیِ شررِ مرا نمودے
بہ ہماں نفسِ بمیرم کہ فرو نشانم او را

مٹے عشق و مستیٰ او نرود بروں ز خونم
کہ دلِ آنچنان ندادم کہ دگر ستانم او را

تو بلوحِ سادہٗ من ہمہ مدعا نوشتی
دگر آنچنان ادب کن کہ غلط نخوانم او را

بمضہورِ تو اگر کس غزلے ز من سراید
چہ شود اگر نوازی بہ ہمیں کہ 'دانم او را'

کفِ خاک ہے اثاثہ ، سرِ رہ اڑا رہا ہوں
اس امید پر کہ اک دن کہوں میں فلک رسا ہوں

مرا چارہ کیا ہے آخر ، سرِ شاخِ علم و دانش
نہ آگا وہ ایک کانٹا جسے دل میں رکھ سکا ہوں

کیا آتشِ جدائی نے مرا شرر آجاگر
کہ جو بچھ گیا تو سمجھو کہ میں مردہ ہو چکا ہوں

مے عشق اور آس کی مستی رہے مرے خوں میں ساری
نہ میں لونگا دل کو واپس کہ میں پیکرِ وفا ہوں

مری لوحِ سادہ پر جو ترا مدعا رقم ہے
دے وہ تربیت ، زباں سے نہ کبھی غلط سرا ہوں

جو ترے حضور کوئی مری اک غزل سنائے
تو کرم ہو تو جو کہہ دے کہ میں اس سے آشنا ہوں

ایں دل کہ مرا دادی لبریزِ یقینِ بادا

ایں جامِ جہاں بینم روشن تر ازینِ بادا

تلخے کہ فرو ریزد گردوں بسفالِ من

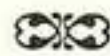
در کامِ کہن رندے آنہم شکرینِ بادا





دل تو نے دیا اس کو لہریزِ یقیں کر دے
اس جامِ جہاں ہیں کو کچھ اور حسین کر دے

وہ تلخ جو گردوں نے کاسہ میں مرے بھر دی
رند اپنے کا دل رکھ لے ، اس کو شکرین کر دے



رمزِ عشقِ تو به اربابِ هوس نتوان گفت
 سخن از تاب و تبِ شعله به خس نتوان گفت
 تو مرا ذوقِ بیان دادی و گفتمی که بگویم
 هست در سینه من آنچه بکس نتوان گفت!

از نهانِ خانه دل خوش غزل می خیزد
 سرِ شاخه همه گویم به قفس نتوان گفت

شوق اگر زنده جاوید نباشد عجب است
 که حدیثِ تو دریں یک دو نفس نتوان گفت!

رمز تیرے عشق کی اہلِ ہوس سے کیا کہوں
تابشِ شعلہ کی باتیں، خار و خس سے کیا کہوں

تو نے فرمایا، کہو، دے کر مجھے ذوقِ بیاں
جو مرے سینے میں ہے نا کس سے، کس سے کیا کہوں

دل کی گہرائی سے اٹھتی ہے طرب افزا غزل
شاخ پر سے کہتا ہوں، کنجِ قفس سے کیا کہوں

یہ عجب تھا، زندہ جاوید گر ہوتا نہ شوق
بات تیری، عارضی سے اس نفس سے کیا کہوں



یادِ ایاً میکہ خوردم بادہ ہا با چنگ و نے
جامِ مے در دستِ من ، میناے مے در دستِ وے!

در کنار آئی خزانِ ما زند رنگِ بہار
ورنیائی فرودیں افسردہ تر گردد ز دے!

بے تو جانِ من چو آن سازے کہ تارش در گُست
در حضور از سینہٴ من نغمہ خیزد بے بہ بے

آنچہ من در بزمِ شوق آورده ام دانی کہ چیست
یک چمن گل ، یک نیستان نالہ ، یک خمخانہ مے!

زندہ کن باز آن محبت را کہ از نیروئے او
بوریاے رہ نشینے درفتد با تختِ کے!

دوستانِ خرم کہ بر منزل رسید آوارہ
من پریشان جادہ ہاے علم و دانش کردہ طے!

یاد ہیں وہ دن کہ پیتا تھا بہ صوتِ چنگ و نے
دوست کے ہاتھوں میں مینا، کف پہ میرے جامِ امے

تُو ہو پہلو میں تو رنگیں ہو خزاں مثلِ بہار
گر نہ ہو، دمے سے فسردہ تر بہاراں کی ہے لے

میری جاں سازِ شکستہ تار ہے تیرے بغیر
پاس جو تُو ہو، اٹھیں سینہ سے نغمے لے بہ لے

جانتا ہے تو کہ بزمِ شوق میں لایا ہوں کیا؟
اک چمن گل، اک نیستان نالہ، اک خمخانہ امے!

زندہ کر پھر وہ محبت جس کی قوت کے طفیل
بوریا اک رہ نشیں کا ہو حریفِ تختِ کے

دوست شاداں ہیں کہ منزل مل گئی آوارہ کو
میں پریشاں، جادہ ہائے علم و دانش کر کے طے!

انجم بگریبان ریخت این دیده تر ما را
بیرون ز سپهر انداخت این ذوقِ نظر ما را

هر چند زمیں سائیم بر تر ز ثریا ئیم
دانی که نمی زبید عمرے چو شرر ما را

شام و سحرِ عالم از گردشِ ما خیزد
دانی که نمی سازد این شام و سحر ما را

این شیشهٔ گردوں را از بادہ تہی کردیم
کم کاسہ مشو ساقی! میناے دگر ما را

شایانِ جنونِ ما پہناے دو گیتی نیست
این رہگزرِ ما را آن رہگزرِ ما را!



انجم مرے دامن کو ملے دیدہ تر سے
گزرنا حدِ افلاک سے میں ذوقِ نظر سے

ہر چند زمینی ہوں، تریا سے ہوں برتر
تسکین نہیں ہو سکتی مری عمرِ شرر سے

یہ شام و سحر ہیں مری گردش کا نتیجہ
اپنی نہ کبھی نبھ سکی اس شام و سحر سے

صہبا سے کیا میں نے تہی شیشہ گردوں
ساقی نہ ہو خست، ملے میناے دگر سے

شایاں مرے سودا کے نہیں دشتِ دو عالم
آتے ہیں نظر دونوں مجھے راہگزر سے

خاور کہ آسماں بہ کمندِ خیالِ اوست
 از خویشتن گسسته و بے سوزِ آرزوست
 در تیرہ خاکِ او تب و تابِ حیات نیست
 جولانِ موجِ را نگرانِ از کنارِ جُوست!
 بتخانہ و حرمِ ہمہ افسردہ آتشے
 پیرِ مغانِ شرابِ ہوا خورده در سبوست
 فکرِ فرنگِ پیشِ مجازِ آورد سُجود
 بینائے کور و مستِ تماشاے رنگ و بوست!
 گردندہ تر ز چرخ و رباینده تر ز مرگ
 از دستِ او بدامنِ ما چاکِ بے رفوست!
 خاکی نہاد و خو ز سپہرِ کہن گرفت
 عیار و بے مدار و کلانِ کار و تو بتوست!
 مشرقِ خراب و مغربِ ازاں بیشترِ خراب
 عالمِ تمامِ مردہ و بے ذوقِ جستجوست!
 ساقیِ بیارِ بادہ و بزمِ شبانہ ساز
 ما را خرابِ یکِ نگہِ محرمانہ ساز

مشرق کہ ہے بلند خیالی سے سُرخ رُو
 بیگانہ اپنے آپ سے ، بے سوزِ آرزو
 مٹی میں اس کی تاب و تبِ زندگی نہیں
 جولانِ موج کا ہوا ناظرِ کنارِ جُو
 بتخانہ و حرم کی فسردہ ہوئی ہے آگ
 بے کیفِ مے سے ، پیرِ مغان کا ہے پُر سبو
 فکرِ فرنگِ کرتی ہے سجدہ مجاز کو
 بینائے کور! مستِ تماشائے رنگ و بُو!
 گردش میں چرخ سے سوا ، مہلک ہے مرگ سے
 دامن کا چاک اپنا اسی سے ہے بے رفو
 عیار و بے مدار و کلان کار و پیچ پیچ
 خاکی نہاد ، اور ہے پیرِ فلک کی خو
 مشرق خراب ہو چکا ، مغرب خراب تر
 عالم تمام مردہ و بے ذوقِ جستجو
 لا بادہ ساقی ، زینتِ بزمِ شبانہ کر
 کر مستیاں عطا ، نگہِ محرمانہ کر

فرصتِ کشمکشِ مدہ این دلِ بے قرار را
 یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را

از تو درونِ سینہ ام برق تجلی کہ من
 با مہ و مہر داہ ام تلخی انتظار را

ذوقِ حضور در جہاں رسمِ صنمِ گری نہاد
 عشقِ فریب می دہد جانِ امیدوار را

تا بفراغِ خاطرے نغمہ تازہ ز نم
 باز بہ مرغزارِ دہ طائرِ مرغزار را

طبعِ بلند دادہ ، بند ز پائے من کشائے
 تا بہ پلاس۔ تو دہم خلعتِ شہریار را

تیشہ اگر بسنگ زد این چہ مقامِ گفتگو است
 عشق بدوش می کشد این ہمہ کوهسار را!

فرصتِ کشمکش نہ دے اس دلِ بے قرار کو
اور بھی تابدار کر گیسوے تابدار کو

سینے میں تیرے جلوے کی بجلیاں نور پاش ہیں
حیراں ہیں مہر و ماہ لیے تلخیٰ انتظار کو

ذوقِ حضور سے پڑی دنیا میں رسمِ بتگری
دیتا رہا فریب عشقِ جانِ امیدوار کو

تا کہ وہ نغمہ گا سکوں جس سے فراغِ دل ملے
پھر وہی مرغزار دے طائرِ مرغزار کو

طبعِ بلند کی عطا ، کھول دے میرے بندِ پا
بدلوں ترے پلاس سے خلعتِ شہر یار کو

سنگ پہ تیشہ زن ہوا ، کیا ہے مقامِ گفتگو
عشق تو دوش پر لیے پھرتا ہے کہنساں کو!

جانم در آویخت با روزگاران
جوئے است نالان در کوهساران!

پیدا ستیزد ، پنہاں ستیزد
نا پایدارے با پایداراں!

این کوه و صحرا این دشت و دریا
نے رازداراں نے غمگساراں

بیگانہ شوق ! بیگانہ شوق !
این جوئباراں این آبشاراں

فریاد نے سوز ! فریاد نے سوز !
بانگِ ہزاراں در شاخساراں

داغے کہ سوزد در سینہ من
آن داغ کم سوخت در لالہ زاراں!

محمل ندارد ساقی ندارد
تلخے کہ سازد با بے قراراں!

مری جاں الجھتی ہے با روزگاراں
ہے نالاں ندی در برِ کوہساراں!

عجبرن پڑا ہے ، عیاں بھی ، نہاں بھی
کہ فانی الجھتا ہے با پائیداراں

یہ کہسار و صحرا ، یہ دشت اور دریا
نہ یہ رازداراں ، نہ یہ غمگساراں

تہی شوق سے یہ ، تہی شوق سے وہ
وہ ہوں جوئباراں کہ ہوں آبشاراں

ہے فریاد بے سوز ! فریاد بے سوز!
سنی شاخساروں سے بانگِ ہزاراں

مرے سینہ میں داغ جو جل رہا ہے
دکھائیں تو ایسا کوئی لالہ زاراں!

نہیں رکھتی محفل ، نہیں رکھتا ساقی
وہ مے جس سے شاداں رہیں بے قراراں!

به تسلی که دادی نگذاشت کارِ خود را
بتو باز می سپارم دلِ بی یقرا را

چه دلِ که محنتِ او ز نفس شاری او
که بدستِ خود ندارد رگِ روزگارِ خود را

بضمیرت آرمیدم تو بجوشِ خود نمائی
بکناره برفگندی درِ آبِ دارِ خود را

مه و انجم از تو دارد گله ها ، شنیده باشی
که بجاکِ تیره ما زاده شرارِ خود را

خلشِ بسینه ما ز خدنگِ او غنیمت!
که اگر بیائش افتد نبرد شکارِ خود را

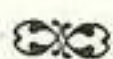
نہیں چلتا اس تسلی پہ یہ کاروبار اپنا
تجھے کر رہا ہوں واپس دلِ بے قرار اپنا

مرے دل کو غم یہ کھائے، ہے نفس شمار پیہم
کہ نہیں ہے اس کے ہاتھوں میں نظامِ کارِ اپنا

میں ترے ضمیر میں تھا، تری خود نمائیوں نے
پرے اک طرف کو پھینکا دُرِ آبدار اپنا

گلے تو نے ماہ و انجم کے سنے تو ہونگے شاید
مری خاک کو جو تو نے دیا ہے شرار اپنا

خلش آس کے تیر کی ہے مرے سینے میں غنیمت
نہ اٹھائے پیشِ پا سے جو گرا شکار اپنا



بحرفے می توان گفتن تمنای جہانے را
من از ذوقِ حضوری طول دادم داستانی را

ز مشتاقان اگر تابِ سخن بردی نمیدانی
محبت می کند گویا نگاهِ بے زبانے را!

کجا نورے کہ غیر از قاصدی چیزے نمی داند
کجا خاکے کہ در آغوش دارد آسہانے را!

اگر یک ذره کم گردد ز انگیزِ وجودِ من
باین قیمت نمی گیرم حیاتِ جاودانے را!

من اے دریائے بے پایاں بہ موجِ تو در افتادم
نہ گوهر آرزو دارم نہ می جویم کرانے را

ازاں معنی کہ چون شبیم بجانِ من فرو ریزی
جہانے تازہ پیدا کردہ ام عرضِ فغانے را

بیاں کا حرف اک کافی تمنائے جمہاں کو
مرے ذوقِ حضوری نے بڑھایا داستاں کو

سخن کی تاب چھینی تو نے مشتاقوں سے ، پھر کیا
محبت گویا کرتی ہے نگاہِ بے زباں کو !

کہاں وہ نور جو جز قاصدی جانے نہ کیچھ بھی
کہاں وہ خاک جو آغوش میں لے آسماں کو !

مرے پیکر سے تاب و تب جو اک ذرہ بھی کم ہو
نہ اس قیمت پہ لٹوں ہر گز حیاتِ جاوداں کو !

میں اے دریاے بے پایاں گرا موجوں میں تیری
نہ مجھ کو چاہئے گوہر ، نہ ڈھونڈوں میں کراں کو

جو معنی تو نے برسائے جوں شبیم جاں پہ ، آن سے
بنایا میں نے اک تازہ جمہاں عرضِ فغاں کو

چند بروے خود کشی پردہ صبح و شام را
چہرہ کشا تمام کن جلوہ نا تمام را

سوز و گداز حالتے است! بادہ ز من طلب کنی
پیش تو گریبان کم مستیٰ این مقام را!

من بسرو! زندگی آتش او فزودہ ام
تو نم شبینمے بدہ لالہ تشنہ کام را

عقل ورق ورق بشگت عشق بہ نکتہ رسید
طائر زیر کے برد دانہ زیر دام را

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست
سوے قطار می کشم ناقہ بے زمام را!

وقت برہنہ گفتن است من بہ کنایہ گفتہ ام
خود تو بگو کجا برم ہم نفسان خام را!

کب تک رکھیگا رُخ پہ تو پردہ صبح و شام کو
چہرہ دکھا ، تمام کر جلوہ نا تمام کو

سوز و گداز ہے وہ حال ، مجھ سے تو مے طلب کرے
ظاہر کروں جو تجھ پہ میں مستی کے اس مقام کو!

میرے سرودِ درد سے اور بھی بھڑکی آس کی آگ
اوس سے ہو عطائے نم لالہ تشنہ کام کو

گھومی خرد ورق ورق ، عشق نے نکتہ پا لیا
طائر ذکی تھا ، لے گیا دانہ زیرِ دام کو

نغمہ کجا ہے میں کجا ، سازِ سخن بہانہ ہے
لاتا ہوں پھر قطار میں ناقہ بے زمام کو!

وقت تھا کہتا واشگاف ، میں نے کنا لے سے کہا
تو ہی بتا کروں میں کیا ہم نفسانِ خام کو!

نفسِ شمار به پیچاکِ روزگارِ خودیم
مثالِ بحرِ خروشیم و در کنارِ خودیم

اگرچه سطوتِ دریا اماں به کس ندهد
بخلوتِ ضدفِ او نگاهدارِ خودیم

ز جوهرے که نہاں است در طبیعتِ ما
مپرس صیرفیاں را کہ ما عیارِ خودیم

نہ از خرابہٴ ما کس خراج می خواهد
فقیرِ راه نشینیم و شہریارِ خودیم

درونِ سینہٴ ما دیگرے! چه بوالعجبی است!
کر اخبار کہ توئی یا کہ ما دوچارِ خودیم!

کشایِ پردہ ز تقدیرِ آدمِ خاکی
کہ ما بہ رہگذرِ تو در انتظارِ خودیم!

نفس شمار و گرفتارِ روزگار ہیں ہم
مثال بحرِ نخر و شاں سرِ کنار ہیں ہم

نہیں ہے سطوتِ دریا سے گو کسی کو اماں
صدف کے گوشے میں، اپنے نگاہدار ہیں ہم

ہمارے جوہرِ فطرت کو سمجھے کیا صراف
مصافِ دہر میں خود اپنا ہی عیار ہیں ہم

نہیں ہمارے خرابے سے لیتا کوئی خراج
فقیرِ راہ نشیں اور شہزیار ہیں ہم

ہمارے سینہ میں ہو کوئی دوسرا، ہے عجب
نہ جانے تو ہے کہ خود اپنے سے دوچار ہیں ہم

ہٹا دے پردہ تقدیرِ آدمِ خاکی
خود اپنے منتظر اثنائے رہگذار ہیں ہم

بہ فغان نہ لب کشودم کہ فغان اثر ندارد
غم۔ دل نگفته بہتر ہمہ کس جگر ندارد

چہ حرم چہ دیر ہر جا سخنی ز آشنائی!
مگر این کہ کس ز رازِ من و تو خبر ندارد!

چہ ندیدنی است اینجا کہ شررِ جہانِ ما را
نفسے نگاہ دارد نفسے دگر ندارد!

تو ز راہِ دیدہ ما بضمیرِ ما گزشتی
مگر آنچنان گزشتی کہ نگہ خبر ندارد!

کس ازین نگیں شناساں نگذشت بر نگینم
بتو می سپارم او را کہ جہاں نظر ندارد

قدحِ خرد فروزے کہ فرنگ داد ما را
ہمہ آفتاب لیکن اثرِ سحر ندارد!

کیجئے فغاں تو کس لیے ، نالہ میں جب اثر نہیں
کیا ہو بیانِ دردِ دل ، ہر کوئی ذی جگر نہیں

کعبہ کی ہو کہ دیر کی ، بات ہے آشنائی کی!
راز ہے تیرا میرا کیا ، کوئی بھی باخبر نہیں!

دیکھی جو تھی نہ دیکھنی ، میرے جہان کا شرر
آتا ہے ایک دم نظر ، پیدا دمِ دگر نہیں!

آنکھ کے راستے سے تو دل میں مرے اتر گیا
لیکن کچھ اس طرح کہ خود آنکھ کو بھی خبر نہیں!

چل دے ماہرِ نگیں ، میرے نگیں کو چھوڑ کر
تجھ کو میں کیوں نہ سونپ دوں ، دنیا تو دیدہ ورنہیں

پایا ہے جو فرنگ سے جام ، خرد فروز ہے
گو ہمہ آفتاب ہے پر وہ سحر اثر نہیں!

ما کہ افتندہ تر از پرتوِ مه آمدہ ایم
کس چہ داند کہ چساں این ہمہ رہ آمدہ ایم

با رقیبان سخن از دردِ دل ما گفتی
شرمسار از اثرِ نالہ و آہ آمدہ ایم

پردہ از چہرہ بر افگن کہ چو خورشیدِ سحر
بہر دیدارِ تو لبریزِ نگہ آمدہ ایم

عزمِ ما را بہ یقیں پختہ ترک ساز کہ ما
اندریں معرکہ لے خیل و سپہ آمدہ ایم

تو ندانی کہ نگاہِ سرِ را ہے چہ کند
در حضورِ تو دعا گفتہ برہ آمدہ ایم



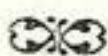
افتادگی میں بڑھ گئے ہم عکسِ ماہ سے
کس کو خبر کہ آئے ہیں ہم کیسی راہ سے

یوں تیرے میرے درد کی باتیں ہوں غیر سے!
شرمندہ ہم ہیں اپنی فغاں، اپنی آہ سے

پردہ ہٹا کہ دید کو خورشید وار ہم
دامانِ دیدہ لائے ہیں بھر کر نگاہ سے

کر دے ہمارے عزم کو راسخ یقین سے
آئے ہیں رن میں عاری ہیں خیل و سپاہ سے

جانے تو کیا نگاہِ سرِ راہ کا اثر
تجھ کو دعائیں دے کے ہم آئے ہیں راہ سے!



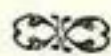
اے خدائے مہر و مہ خاکِ پریشانی نگر
ذرہ در خود فرو پیچد بیابانی نگر

حسنِ لے پایاں دروُنِ سینہٗ خلوت گرفت
آفتابِ خویش را زیرِ گریبانی نگر!

بر دلِ آدم زدی عشقِ بلا انگیز را
آتشِ خود را باغوشِ نیستانی نگر!

شوید از دامانِ ہستی داغہائے کہنہ را
سخت کوشی ہائے این آلودہ دامانے نگر!

خاکِ ما خیزد کہ سازد آسمانے دیگرے
ذرہ نا چیز و تعمیرِ بیابانی نگر!



اے خدائے مہر و ماہ ، خاکِ پریشان دیکھ لے
ذرہ نے خود میں سمویا ہے بیابان دیکھ لے !

حسنِ بے پایاں ہوا اک سینہ میں خلوت گزیر
آفتاب اپنا نہاں زیرِ گریبان دیکھ لے !

قلبِ آدم کو عطا کیں عشق کی بے تابیاں
اپنی آتش کو باغوشِ نیستان دیکھ لے !

داغِ کہنہ دامنِ ہستی سے ہے یہ دھو رہا
کتنا محنت کش ہے یہ آلودہ داماں دیکھ لے !

خاک اٹھتی ہے مری تا بن سکے اور آسماں
ذرہ ناچیز و تعمیرِ بیابان دیکھ لے !





بقره منظر یکایک ساله چوبه در ایضاً

بقره منظر یکایک ساله چوبه در ایضاً

بقره منظر یکایک ساله چوبه در ایضاً

زبورِ عجم

حصه دوم

شاخِ نهالِ سدره، خار و خسِ چمن مشو

منکرِ او اگر شدی منکرِ خویشان مشو

بقره منظر یکایک ساله چوبه در ایضاً

بقره منظر یکایک ساله چوبه در ایضاً





زبورِ عجم

حصہ دوم

شاخِ نہالِ سدرہ 'تو خار و خسِ چمن نہ ہو
منکر ہو آس کا 'تو مگر ، منکرِ خویشی نہ ہو



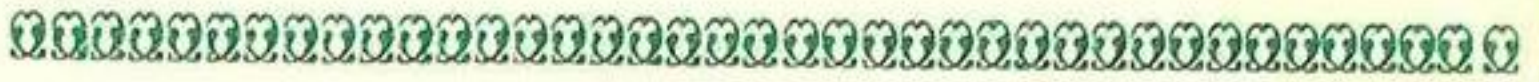
دو عالم را توان دیدن بمینائے کہ من دارم
کجا چشمے کہ بیند آن تماشائے کہ من دارم

دگر دیوانہ آید کہ در شہر افگند ہونے
دو صد ہنگامہ بر خیزد از سودائے کہ من دارم

مخور نادان غم از تاریکی شہبا کہ می آید
کہ چون انجم درخشد داغِ سیما کہ من دارم

ندیمِ خویش می سازی مرا لیکن ازاں ترسم
نداری تابِ آن آشوب و غوغائے کہ من دارم



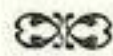


دکھا سکتا ہے دو عالم یہ مینا جو میں رکھتا ہوں
کہاں دیدہ کہ دیکھے وہ نظارا جو میں رکھتا ہوں

کوئی دیوانہ آئے شہر میں آوازِ ہو اٹھے
دو صد ہنگاموں کا خالق ہے سودا جو میں رکھتا ہوں

نہ کر تاریکیوں کی فکر ، راتیں جنکو لائینگی
ہے روشن مثلِ کوکب داغِ سیا جو میں رکھتا ہوں

بناتا ہے ندیم اپنا مجھے ، یہ خوف ہے مجھ کو
نہ راس آئے تجھے آشوب و غوغا جو میں رکھتا ہوں



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

۱

بر خیز که آدم را ، هنگام نمود آمد
این مشتِ غباری را انجم به سجود آمد!
آن راز که پوشیده در سینه هستی بود
از شوخی آب و گل در گفت و شنود آمد!

۲

مه و ستاره که در راه شوق هم سفر اند
کرشمه سنج و ادا فهم و صاحب نظر اند

چه جلوه هاست که دیدند در کفِ خاک
قفا بجانب افلاک سوئے ما نگرند



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۱

اٹھو کہ خاکوں کا یہ وقتِ نمود ہے
آن کے لئے ستارہ سراپا سجود ہے

پوشیدہ تھا جو سینہ ہستی میں ، اب وہ راز
شوخی سے آب و گل کی ، قرینِ شہود ہے

۲

ماہ و ستارہ شوق کی رہ میں ہیں ہم سفر
رمزِ آشنائے ناز و ادا ، صاحبِ نظر

آئے پسند جلوے انہیں مشتیِ خاک کے
ہے پشتِ سوئے آسماں ، اور ہیں زمیں نگر



درونِ لاله گزر چون صبا توانی کرد
بیک نفس گره غنچه وا توانی کرد

حیات چیست؟ جهان را اسیرِ جان کردن
تو خود اسیرِ جهانی ، کجا توانی کرد!

مقدر است که مسجودِ مهر و مه باشی
ولے ہنوز ندانی چہا توانی کرد!

اگر ز میکدہ من پیالہ گیری
ز مشتی خاکِ جهانی پیا توانی کرد!

چساں بسینہ چراغے فروختی اقبال
بخویش آنچه توانی بما توانی کرد!



درونِ لالہ ممکن ہے گزرِ مثلِ صبا تیرا
نفس، اک آن میں کر دے گرہِ غنچے کی وا، تیرا

جہاں کو کر اسیرِ جاں، اسی میں زندگانی ہے
تو خود دنیا کا قیدی ہے، رواں ہو کار کیا تیرا

مقدر ہے کہ تو مسجودِ مہر و ماہ ہو جائے
مگر اس راز کو سمجھا نہ فکرِ نارسا تیرا

جو میرے میکدے سے ایک ساغرِ تجھ کو مل جائے
تو مشّتِ خاک سے عالمِ بپا ہو گا نیا تیرا

کیا روشن چراغِ اقبالؒ تو نے کیسے سینے میں
اجالا ہم کو بھی بخشے وہی دستِ عطا تیرا



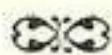
اگر بہ بحرِ محبت کرانہ می خواہی
ہزار شعلہ دہی یک زبانہ می خواہی!

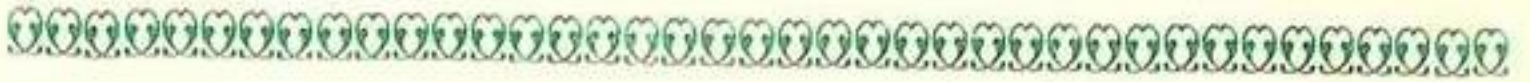
مرا ز لذتِ پرواز آشنا کردند
تو در فضا کے چمنِ آشیانہ می خواہی!

یکے بدامنِ مردانِ آشنا آویز
ز یار اگر نگہِ محرمانہ می خواہی

جنوں نہ داری و ہوئے فگندہ، در شہر
سبو شکستی و بزمِ شبانہ می خواہی!

تو ہم بعشوقہ گری کوش و دلبری آموز
اگر ز ما غزلِ عاشقانہ می خواہی





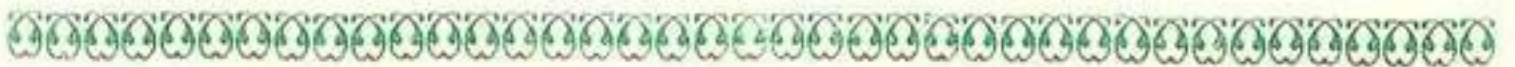
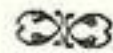
طلب گر تو کرے بحرِ محبت میں کرانہ
عوض اک شعلہ کے کھوئے گا شعلوں کا خزانہ!

مجھے پرواز کی لذت سے فطرت نے نوازا
ترا مقصد فضائے گلستاں میں آشیانہ!

ہوں چندے ہم نشیں صاحبِ دلانِ آشنا کا
جو چاہے یار سے گاہے نگاہِ محرمانہ

جنوں سے 'تو ہے خالی اور نگر میں شور تیرا؟
سبو کو توڑ کر ہے طالبِ بزمِ شبانہ!

اداے دلبری، عشوہ گری، کے سیکھ نکتے
غزل مجھ سے اگر تو چاہتا ہے عاشقانہ



زمانہ قاصدِ طیارِ آن دلا رام است
چہ قاصدے کہ و جودش تمام پیغام است!

گماں مہر کہ نصیبِ تو نیست جاوہ دوست
درونِ سینہ ہنور آرزوے تو خام است!

گرفتم این کہ چو شاہیں بلند پروازی
بہوش باش کہ صیاد ما کہن دام است

باوجِ مشتیِ غبارے کجا رسد جبریل
بلند نامی او از بلندی بام است!

تو از شمارِ نفسِ زندہ نمی دانی
کہ زندگی بہ شکستِ طلسمِ ایام است!

ز علم و دانشِ مغرب ہمیں قدر گویم
خوش است آہ و فغاں تا نگاہ ناکام است

من از ہلال و چلیپا دگر نیندیشم
کہ فتنہ دگرے در ضمیرِ ایام است!

زمانہ لایا ہے ہم تک پیامِ دلآرام
وجودِ قاصدِ طیار ہے پیامِ تمام!

گہاں نہ کر کہ نہ ہوگا نگار کا دیدار
مگر ابھی ترے سینے میں آرزو ہے خام!

بلند صورتِ شاہیں سہی تری پرواز
حذر! پرانا شکاری بچھا رہا ہے دام

نہ مشتِ خاک کی رفعت کو پا سکا جبریل
بلند با می سے آس کو ملی بلندیِ نام!

نفس شمار تری زندگی، تو کیا جانے
کہ زندہ ہے وہی توڑے جو جادوے ایام!

علوم و دانشِ مغرب کی بات اتنی ہے
ہے خوب آہ و فغاں جب نگاہ ہے ناکام

مجھے نہیں ہے ہلال و صلیب سے کچھ خوف
اک اور فتنے کا گہوارہ ہے دلِ ایام!

دگر ز سادہ دلہائے یار نتوان گفت
نشستہ بر سرِ بالینِ من ز درماں گفت!

زباں اگرچہ دلیر است و مدعا شیرین
سخن ز عشق چہ گویم جز این کہ نتوان گفت

خوشا کسے کہ فرو رفت در ضمیرِ وجود
سخن مثالِ گہر بر کشید و آساں گفت

خرابِ لذتِ آنم کہ وں شناخت مرا
عتابِ زیرِ لبی کرد و خانہ ویراں گفت

غمیں مشو کہ جہاں رازِ خود بروں نہد
کہ آنچه گل نتوانست مرغِ نالان گفت

پیامِ شوق کہ من بے حجاب می گویم
بہ لالہ قطرہٴ شبنم رسید و پہناں گفت

اگر سخن ہمہ شوریدہ گفته ام چہ عجب
کہ ہر کہ گفت ز گیسوئے او پریشاں گفت

یار کی سادہ دلی کا ہو تو کیسے ہو بیاں
بیٹھ کر بالیں پہ کرتا ہے وہ ذکرِ درماں!

حوصلہ مند زباں ، مدعا شیریں بھی ہے
عشق کی بات مگر کیا ہو کہ عاجز ہے زباں

ہستی کے عمق میں آرا جو کوئی ، خوب ہوا
گوہرِ معنی لیے آیا بحرفِ آساں

مستِ لذت ہوا میں جب مجھے پہچان گیا
زیرِ لب غصے سے کہ اٹھا وہ 'خانہ ویراں،

ہو نہ غمگین جو جہاں کانہ 'کھلے تجھ پر راز
کہ جو گل کہہ نہ سکا ، کہہ گیا مرغِ نالاں

شوق کا مژدہ میں کہتا ہوں جسے بے پردہ
لالے سے قطرۂ شبنم نے کہا وہ پنہاں

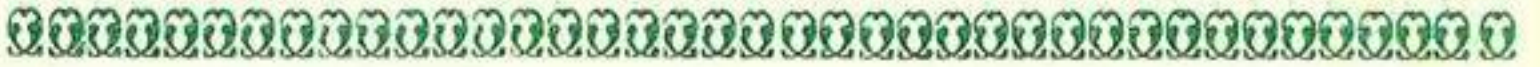
شعر میرا ہے جو شوریدہ ، تعجب کیسا
آس کے گیسو کا ہے ہر لب پہ پریشاں ہی بیاں



خرد از ذوقِ نظر گرم تماشا بود است
این که جوینده و یابنده هر موجود است

جلوهٔ پاک طلب، از مه و خورشید گزر
زانکه هر جلوه درین دیرنگه آلود است





←

دکھایا ذوقِ نظر نے خرد کو منظرِ بُود
تلاش کر لیا کوشش سے اُس نے ہر موجود

وہ جلوہ ڈھونڈ کہ ہوئے نیازِ مہر و قمر
ہر ایک جلوہ ہے اس دہر میں نظرِ آلود



غلامِ زندہ دلانم کہ عاشقِ سرہ اند
 نہ خانقاہ نشینان کہ دل بہ کس ندهند

بآن دلے کہ برنگ آشنا و بیرنگ است
 عیارِ مسجد و میخانہ و صنم کدہ اند

نگاہ از مہ و پرویں بلند تر دارند
 کہ آشیان بگریبانِ کمکشان نہ نہند

بروں ز انجمنے درمیانِ انجمنے
 بخلوت اند وے آنچنان کہ با ہمہ اند

بچشمِ کم منگر عاشقانِ صادقِ را
 کہ این شکستہ بہایان متاعِ قافلہ اند

بہ بندگانِ خطِ آزادگی رقم کردند
 چنانکہ شیخ و برہمن شبانِ لے رمہ اند

پیالہ گبر کہ مے را حلال می گویند
 حدیث اگرچہ غریب است راویان ثقہ اند

جو زندہ دل ہیں مخلص عشق میں ، وہ میرے سلطان ہیں
 نہ زاہد خانقاہوں کے کہ ہر اک سے گریزاں ہیں
 وہ اُس دل کی بدولت جو ہے رنگینی میں بھی بے رنگ
 صنم خانہ کے ، میخانہ کے اور مسجد کے میزاں ہیں
 نگاہیں ماہ و پرویں سے بھی ہوتی ہیں بلند آن کی
 پرے ہو کہہ کشاں سے آشیاں ، وہ اس کے خواہاں ہیں
 درونِ انجمن رہ کر ، برونِ انجمن ہیں وہ
 وہ خلوت میں رہیں لیکن رفیقِ نوعِ انساں ہیں
 نہ جانو کم وقار آن کو جو عشق اپنے میں صادق ہیں
 متاعِ قافلہ ہیں یہ ، بظاہر گو یہ ارزاں ہیں
 غلاموں کو ملا ہے اس طرح منشورِ آزادی
 ہیں غائب گلے اور شیخ و برہمن گاہ باناں ہیں
 اٹھا ساغر ، لگا لب سے ، حلال اب مے کو کہتے ہیں
 روایت ہے غریب^۱ اس کی ، پہ راوی پختہ انساں ہیں

^۱ غریب - علم الحدیث کی اصطلاح میں وہ حدیث جس میں کسی جگہ ایک ہی راوی منفرد ہو -

لالهٔ این چمن آلودهٔ رنگ است هنوز
سپر از دست مینداز که جنگ است هنوز

فتنهٔ را که دو صد فتنه باغوشش بود
دخترِ هست که در مهلکِ فرنگ است هنوز

اے که آسوده نشینی لبِ ساحلِ برخیز
که ترا کار بگرداب و نهنگ است هنوز

از سرِ تیشه گزشتن ز خرد مندی نیست
اے بسا لعل که اندر دل سنگ است هنوز

باش! تا پرده کشایم ز مقامِ دگرے!
چه دهم شرحِ نواها که پچنگ است هنوز!

نقش پردازِ جہاں چون بچونم نگرِ یست
گفت ویرانه بسوداے تو تنگ است هنوز!

لالہ اس باغ میں آلودہ ہے با رنگ ابھی
تھام لے اپنی سپر، ختم نہیں جنگ ابھی

فتنہ آغوش میں جس کی ہیں دو صد فتنے نہاں
اس کی دختر ہے بہ گہوارۂ افرنگ ابھی

اٹھ کنارے سے، یہ آرام کا ہنگام نہیں
ہے بھنور اور مگر مچھ سے تری جنگ ابھی

ترک تیشہ ہے خرد مندی سے 'دوری کا اثر
پنہاں رکھتا ہے کئی لعل دلِ سنگ ابھی

اک مقام اور ہے، میں پردہ اٹھاتا ہوں، ٹھہر
ذکر کیا 'سر کا جو مضمہ ہے تہ چنگ ابھی!

کی نگہ خالقِ اکبر نے جنوں پر جو مرے
کہا، ویرانہ ہے سودا پہ ترے تنگ ابھی!

تکیہ بر حجت و اعجازِ بیاں نیز کنند
کارِ حق گاہ بشمشیر و سنان نیز کنند

گاہ باشد کہ تہ خرقہ زرہ می پوشند
عاشقان بندہٗ حال اند و چنان نیز کنند

چون جہاں کہنہ شود پاک بسوزند او را
و زہماں آب و گل ایجادِ جہاں نیز کنند

ہمہ سرمایہٗ خود را بنگاہے بدہند
این چہ قومیت کہ سودا بزیاں نیز کنند

آنچہ از موجِ ہوا با پرِ کاہے کردند
عجبے نیست کہ با کوہِ گراں نیز کنند

عشق مانندٗ متاعے است بیزارِ حیات
گاہ ارزاں بفروشد و گراں نیز کنند

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ
عشق کارے است کہ بے آہ و فغان نیز کنند

کارِ حقِ حجت و اعجازِ بیان کرتے ہیں
گاہ ہوتا ہے کہ شمشیر و سنان کرتے ہیں

زیرِ خرقہ کبھی ہوتے ہیں زرہ پوش بھی وہ
بندۂ حال ہیں عاشق ، یہ عیاں کرتے ہیں

جب جہاں ہوتا ہے کہنہ تو جلا دیتے ہیں
راکھ سے آس کی پھر ایجاد جہاں کرتے ہیں

اک نظر کے لیے دے دیتے ہیں سرمایہ تمام
ہیں عجب لوگ جو سوداے زیاں کرتے ہیں

رکھتے ہیں تنکے کو آوارہ سرِ موجِ ہوا
کیا عجب ، کوہِ گراں کو جو رواں کرتے ہیں

عشق بھی جنسِ تجارت ہے بیا زارِ حیات
ارزاں کرتے ہیں کبھی ، گاہ گراں کرتے ہیں

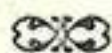
نالہ کش ہوں کہ تجھے خواب سے بیدار کروں
عشق ورنہ کبھی بے آہ و فغاں کرتے ہیں!

چو موج مستِ خودی باش و سر بطوفان کش
ترا که گفت که بنشین و پا بداماں کش

بقصدِ صیدِ پلنگ از چمن سرا بر خیز
بکوه رخت کشا خیمه در بیابان کش

به مهر و ماه کمندِ گلو فشار انداز
ستاره را ز فلک گیر و در گریبان کش

گرفتم این که شرابِ خودی بسے تلخ است
بدردِ خویش نگر زهرِ ما بدرماں کش



خودی میں مست ہو جوں موج ، سر ہو طوفاں میں
 نہ بیٹھ یوں کہ سمیٹے ہوں پاؤں داماں میں

چمن سرا سے نکال ، کر شکار چیتوں کا
 سفر ہو کوہ میں ، خیمہ ترا بیاباں میں

ہو مہر و ماہ کی گردن کے گرد تیری کمند
 ستارہ چھین فلک سے ، سجا گریباں میں

یہ مانا میں نے شرابِ خودی ہے تلخ بہت
 جو درد تیرا ہے ، تلخی طلب ہے درماں میں



خضرِ وقت از خلوتِ دشتِ حجاز آید برون
 کاروانِ زینِ وادیِ دور و دراز آید برون

من بسیمای غلامانِ فرّ سلطان دیده ام
 شعلهٔ محمود از خاکِ ایاز آید برون!

عمرها در کعبه و بتخانه می نالد حیات
 تا ز بزمِ عشق یک دانای راز آید برون!

طرحِ نو می افکنند اندر ضمیرِ کائنات
 ناله ها کز سینهٔ اهلِ نیاز آید برون!

چنگ را گیرید از دستم که کار از دست رفت
 نغمه ام خوں گشت و از رگهای ساز آید برون!



آئے گا خضرِ وقت اب ، بارگہِ حجاز سے
نکلے گا اپنا کارواں پھر سے رہِ دراز سے

چمکی ہے ہر غلام کے ماتھے پہ سطوتِ شہی
شعلہٴ غزنوی اٹھا خاکِ درِ ایاز سے

صدیوں رہی ہے نالہ خیز کعبہ و دیر میں حیات
نکلے کوئی تو رازداں عشق کی بزمِ ناز سے

اور ابھر کے آئے گی آن سے ضمیر کائنات
نالے اگر بلند ہوں ولولہٴ نیاز سے

لے مری چنگ کو سنبھال ، میں نہیں اپنے آپ میں
نغمہ مرا ہوا ہے خوں ، ٹپکا ہے میرے ساز سے



ز سلطان کنم آرزوے نگاہے!
مسلمانم از گل نہ سازم اللہ ہے

دل بے نیازے کہ در سینہ دارم
گدا را دہد شیوہ پادشاہے

ز گردوں فتد آنچہ بر لالہ من
فرد ریزم او را بہ برگ گیا ہے

پرویں فر و ناید اندیشہ من
بدریوزہ پرتو مہر و ماہے

اگر آفتاے سوے من خرامد
بشوخی بگردانم او را ز راہے

باں آب و تالے کہ فطرت بہ بخشد
درخشم چو برقے بابر سیاہے

رہ و رسم فرمانروایاں شناسم
خراں بر سر بام و یوسف پچا ہے!

سلطان کی مجھ پہ کاش کبھی اک نگاہ ہو
مسلم ہوں میرا مٹی کا کیسے الہہ ہو

سینے میں میرے دل ہے وہ اک نے نیاز سا
یہ دل گدا بھی پائے گا تو وہ پادشاہ ہو

گردوں سے میرے لالے پہ گرتی ہے جو آسے
ٹپکا رہا ہوں میں کہ ہرا برگ گاہ ہو

پرویں کی طرح نیچے نہ آتریگا میرا فکر
سائل نہ ہو گا سامنے گو مہر و ماہ ہو

آئے خرام۔ ناز سے جو آفتاب بھی
شوخی سے پھیردوں آسے ، آوارہ راہ ہو

آس آب و تاب سے مجھے فطرت سے جو ملی
وہ برق ہوں کہ رخشاں بابر سیاہ ہو

واقف ہوں حکمرانوں کی میں رسم و راہ سے
خر بام پر براجیں اور یوسف بہ چاہ ہو

با نشہ درویشی در ساز و دمام زن
چون پخته شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

گفتند جهانِ ما آیا بتو می سازد؟
گفتم که نمی سازد! گفتند که برهم زن!

در میکرده ها دیدم شائسته حریفی نیست!
با رستم دستاں زن با مغبچه ها کم زن

اے لاله صحرائی تنها نتوانی سوخت
این داغِ جگر تاجے بر سینہ آدم زن

تو سوزِ درونِ او، تو گرمیِ خونِ او
باور نکنی؟ چاکے در پیکرِ عالم زن

عقل است چراغِ تو؟ در راهگذارے نه
عشق است ایاغِ تو؟ با بنده محرم زن

لمختِ دلِ پرخو نے از دیدہ فرو ریزم
لعلے ز بدخشانم بردار و بخاتم زن!

سمو کر نشہ درویشی کا ساغر پر دمادم کر
 ہو جب پختہ ، تہ و بالا نظامِ کشورِ جم کر

سوال آن کا یہ تھا ، کیا اس جہاں سے تیری بنتی ہے؟
 کہا میں نے ، نہیں بنتی ، وہ بول اٹھے کہ برہم کر!

میں دیکھ آیا ہوں میخانے ، نہیں موزوں حریف آن میں!
 ہو صحبت رستمِ دستاں سے ، میلِ مرغِ بچہ کم کر

نہیں ممکن کسی صحرا میں تنہا جلنا ، اے لالہ!
 جگر سوزی کا رسیا داغ اپنا ، نذرِ آدم کر

تو ہے سوزِ دروں آس کا ، تو آس کا گرمی خوں بھی
 نہ آئے گر یقیں تجھ کو فگار اندامِ عالم کر

چراغِ عقل گر ہے پاس تیرے ، رہ گزر پر رکھ
 ایاغِ عشق رکھتا ہے؟ شریکِ بزمِ محرم کر

دل پر خوں کے ٹکڑے اپنے اشکوں میں بہاتا ہوں
 اٹھا میرے بدخشاں سے تو لعل اور زیبِ خاتم کر!

هوس هنوز تماشا گرِ جهانداری است
 دگرچه فتنه پس پرده های زنگاری است
 زمان زمان شکنند آنچه می تراشد عقل
 بیا که عقل مسلمان و عقل زناری است!
 امیرِ قافلهٔ سخت کوش و پیهم کوش
 که در قبیلهٔ ما حیدری ز کراری است
 تو چشم بستی و گفتی که این جهان خواب است
 کشای چشم که این خواب خواب بیداری است
 بخلوت انجمنی آفرین که فطرتِ عشق
 یکی شناس و تماشا پسند بسیاری است
 تپید یک دم و کردند زیبِ فتراکش
 خوشا نصیبِ غزاله که زخم او کاری است
 بیاب و راغ گهرهای نغمه می پاشم
 گراں متاع و چه ارزا ز کند بازاری است!

ہوس اب تک دکھاتی ہے تماشائے جہاننداری
 چھپائے کون سا فتنہ ہیں پردہ ہائے زنگاری؟
 تراشے جس کو عقل، آس کو وہ خود کر دیتی ہے ٹکڑے
 مسلمان، عشقِ خود آگاہ ہے اور عقل زناری!
 امیرِ قافلہ گر تو ہے، پیہم سخت کوشی کر
 کہ اپنی قوم میں ہے حیدری کا راز کراری
 کہا یہ تو نے آنکھیں بند کر کے، خواب ہے دنیا
 ذرا کر چشم وا، یہ خواب بھی ہے خوابِ بیداری
 بیا کر انجمنِ خلوت میں، فطرتِ عشق کی یہ ہے
 کہ ہے وحدت شناس اور دیدِ کثرت ہے اسے پیاری
 تڑپ کر لحظہ بھر وہ ہو گیا فتراک کی زینت
 غزالِ بخت و ر وہ ہے کہ جس کا زخم ہے کاری
 میں باغ و راغ میں برس رہا ہوں نغمے کے موتی
 ہوئی جنسِ گراں ارزاں، ہے کیسی سردبازاری!

فرشته گرچه برون از طلسمِ افلاک است
نگاہِ او بتماشائے این کفِ خاک است

گہاں مہر کہ بیکِ شیوہ عشق می بازند
قبا بدوشِ گل و لالہ بے جنوں چاک است

حدیثِ شوق ادا می توان بخاوتِ دوست
بنالہ کہ ز آلائشِ نفس پاک است!

توان گرفت ز چشمِ ستارہ مردم را
خرد بدستِ توشاہینِ تند و چالاک است

کشائے چہرہ کہ آنکس کہ لن ترانی گفت
هنوز منتظرِ جاوہِ کفِ خاک است

دریں چمن کہ سرود است و این نواز کہ جاست؟
کہ غنچہ سر بگریبان و گل عرقناک است!

فرشتہ گو نہیں مسحورِ جادوئے افلاک
 پہ مرکزِ آس کی نگہ کا رہی یہی کفِ خاک

گہاں نہ کر کہ رہا عاشقی کا اک انداز
 کہ بے جنون ہے گل ، لالہ کا گریباں چاک

حریمِ دوست میں ہے شوق کا بیاں ممکن
 بہ شکلِ نالہ جو آلائشِ نفس سے ہو پاک

اچکنا سہل ہے اختر کی آنکھ سے مردم
 تری خرد کا ہے شاہیں جو تیز اور چالاک

اٹھا نقاب کہ وہ لن ترانی گوئے قدیم
 ہے منتظر کہ دکھائیگی جلوہ کب کفِ خاک

چمن میں کس کی اٹھی لے ، کہاں سے آئی نوا؟
 کہ غنچہ سر بگریباں ہے ، روئے گل نمناک

عرب کہ باز دہدِ محفلِ شبانہ کجاست؟
عجم کہ زندہ کند رودِ عاشقانہ کجاست؟

بزیرِ خرقہٴ پیراں سبوچہ ہا خالی است
فغان کہ کس نشناسد مئے جوانہ کجاست؟

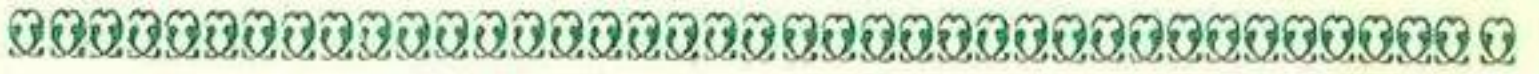
دریں چمن کدہ ہر کس نشیمنے سازد
کسے کہ سازد و وا سوزد آشیانہ کجاست؟

ہزار قافلہ لے گانہ وار دید و گزشت
ولے کہ دید باندازِ محرمانہ کجاست؟

چو موج خیز و بہ یم جاودانہ می آویز
کرانہ می طلبی لے خبر کرانہ کجا است؟

بیا کہ دررگِ تاکِ تو خونِ تازہ دوید
دگر مگوئے کہ آن بادۂ مغانہ کجاست؟

بیک نورد فرو پیچ روز گاراں را
ز دیر و زود گزشتی دگر زمانہ کجاست!



عرب کہ پھر ہمیں دے محفلِ شبانہ ، کہاں
عجم کہ زندہ کرے سازِ عاشقانہ ، کہاں

سبوحے پیروں کے خرقوں کے نیچے خالی ہیں
کسی کو سُدھ نہیں ، ڈھونڈیں مٹے جوانہ کہاں

ہے خواہاں ہر کوئی گلشن میں اک نشیمن کا
بنا کے خود ہی جلا دے جو آشیانہ ، کہاں

ہزار قافلے بیگانہ وار گزرے ہیں
مگر جو دیکھے بانداڑِ محرمانہ ، کہاں

مثالِ موجِ ابھر ، بحر سے الجھتا جا
تو ڈھونڈتا ہے کرانہ مگر کرانہ کہاں

رواں رگوں میں ترے تاک کی ہے تازہ لہو
نہ پوچھ اب کہ ملیگی مٹے مغانہ کہاں

لیٹ دے فقط اک جست میں زماں کی بساط
تو دیر و زود سے بالا ہے ، پھر زمانہ کہاں !



مانند صبا خیز و وزیدن دگر آموز
 دامان گل و لاله کشیدن دگر آموز
 اندر دلک غنچه خزیدن دگر آموز!

موتینه به بر کردی و بے ذوق تپیدی
 آن گونه تپیدی که بجای نه رسیدی
 در انجمن شوق تپیدن دگر آموز!

کافر! دل آواره دگر باره باوبند
 بر خویش کشا دیده و از غیر فروبند
 دیدن دگر آموز و ندیدن دگر آموز!

دم چیست؟ پیام است شنیدی؟ نشنیدی!
 در خاک تو یک جلوه عام است ندیدی!
 دیدن دگر آموز! شنیدن دگر آموز!

اٹھ مثلِ صبا چلنے کا انداز نیا سیکھ
 کھینچے جو گل و لالہ کا دامن وہ ادا سیکھ
 در آنا دلِ غنچہ میں بے جنبشِ پاسیکھ!

موئینہٴ قبا! تیری یہ بے ذوق تپش تھی
 وہ تیری تپش جس سے تو پہنچا نہ کہیں بھی
 آنجمنِ شوق میں پھر سوزِ و فاسیکھ!

کافر! دلِ آوارہ کو پھر آس کی طرف موڑ
 ہو خود نگراں، دیکھنا غیروں کی طرف چھوڑ
 پھر دیکھنا نہ دیکھنا، بادیدہٴ واسیکھ!

ہر سانس ہے پیغام پہ تو گوشِ گراں ہے
 مٹی میں تری جلوہٴ عام ایک نہاں ہے
 گرد دیکھنے سن لینے کا پہلے سے سواسیکھ!



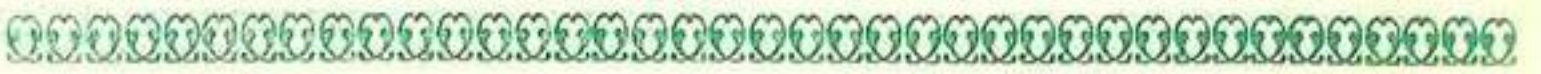
ما چشم عقاب و دل شهباز نداریم
چون مرغِ سرا لذتِ پرواز نداریم
اے مرغِ سرا خیز و پریدن دگر آموز!

تختِ جم و دارا سرِ راهے نفروشدند
این کوهِ گران است بکاھے نفروشدند
با خونِ دلِ خویش خریدن دگر آموز!

نالیدی و تقدیر همان است که بود است
آن حلقهٔ زنجیر همان است که بود است
نومید مشو! ناله کشیدن دگر آموز!

وا سوخته؟ یک شرر از داغِ جگر گیر!
یک چند بخود پیچ و نیتسان همه در گیر!
چون شعله بخاشاک دویدن دگر آموز





ہم میں نہیں ہے چشمِ عقاب و دلِ شہباز
جوں مرغِ سرا دل میں نہیں لذتِ پرواز
اٹھ مرغِ سرا ، شیوہ پروازِ فضا سیکھے !

تختِ جم و دارا سرِ راہے نہ ملیگا
یہ کوہِ گراں قدر بہ کاہے نہ ملیگا
قیمت ترے دل کاہے لہو ، رمزِ سرا سیکھے

تو نالہ کناں ہے تری تقدیر وہی ہے
بے چین ہے تو حلقہٴ زنجیر وہی ہے
مایوس نہ ہو ، نالہ کا انداز نیا سیکھے !

تو جل بجھا ، لے داغِ جگر ہی سے شرارا
خود دار ہو ، پہلو میں سمو نیستان سارا
خاشاک کے حق میں روشِ برقِ فنا سیکھے !

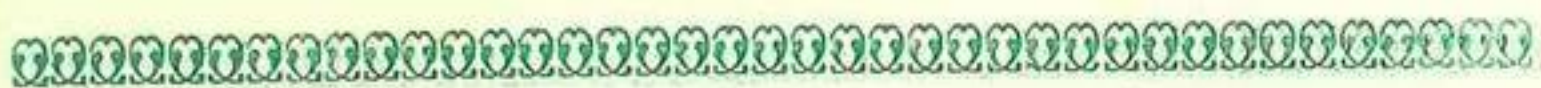


اے غنچہٴ خوابیدہ چو نر گس نگراں خیز
 کاشانہٴ مارفت بتاراجِ غماں خیز
 از نالہٴ مرغِ چمن ، از بانگِ اذان خیز
 از گرمیٰ ہنگامہٴ آتشِ نفساں خیز
 از خوابِ گراں ، خوابِ گراں خوابِ گراں خیز!
 از خوابِ گراں خیز!

خورشید کہ پیرایہ بسیہائے سحر بست
 آویزہ بگوشِ سحر از خونِ جگر بست
 از دشت و جبل قافلہٴ ہا رختِ سفر بست
 اے چشمِ جہاں بیس بہ تماشائے جہاں خیز
 از خوابِ گراں ، خوابِ گراں خوابِ گراں خیز!
 از خوابِ گراں خیز!

اٹھ سوئی کلی ، سیکھ سبق دیدہ وراں سے
 کاشانہ ہمارا ہے نگوں بارِ غماں سے!
 بیدار ہو ببل کی نوا ، بانگِ اذان سے
 اٹھ گرمی ہنگامہ آتشِ نفساں سے!
 اٹھ خوابِ گراں ، خوابِ گراں خوابِ گراں سے
 اٹھ خوابِ گراں سے!

خورشید نے جھومر دیا سیاہے سحر کو
 اور کان کا آویزہ کیا خونِ جگر کو!
 ہر سمت اٹھے قافلے آمادہِ سفر کو
 اے چشمِ جہاں ہیں تو شناسا ہو جہاں سے
 اٹھ خوابِ گراں ، خوابِ گراں خوابِ گراں سے
 اٹھ خوابِ گراں سے!



خاورِ همه مانندِ غبارِ سرِ راهِ است
یک نالهٔ خاموش و اثرِ باخته آہے است
هر ذرہٗ این خاکِ گرہ خورده نگاہے است
از ہند و سمرقند و عراق و ہمدان خیز
از خوابِ گراں ، خوابِ گراں خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز!

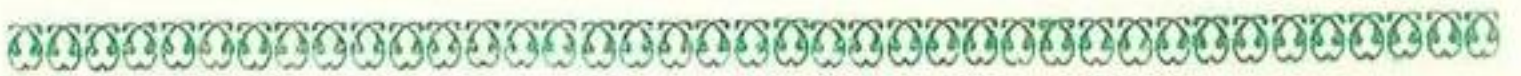
دریائے تو دریاست کہ آسودہ چو صحراست
دریائے تو دریاست کہ افزوں نشد و کاست
بیگانہٗ آشوب و نہنگ است چہ دریاست!
از سینہٗ چاکش صفتِ موجِ رواں خیز
از خوابِ گراں ، خوابِ گراں خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز!





مشرق ہوا بس ایک غبارِ سرِ راہے
اک نالہ لے صوت و صدا ، لے اثر آہے
ہر ذرہ ہے اس خاک کا افسردہ نگاہے
اٹھ ہند و سمرقند و عراق و ہمدان سے
اٹھ خوابِ گراں ، خوابِ گراں خوابِ گراں سے
اٹھ خوابِ گراں سے !

صحرا کی طرح وقفِ سکون ہے ترا دریا
چڑھنے بھی نہ پایا کہ کناروں سے یہ آتا
طوفان نہ نہنگ اس میں ، یہ دریا ہے تو کیسا
اٹھ سینے سے اس کے روشِ موجِ رواں سے
اٹھ خوابِ گراں ، خوابِ گراں خوابِ گراں سے
اٹھ خوابِ گراں سے !





این نکته کشانیده اسرارِ نهان است
ملک است تنِ خاکی و دینِ روحِ روان است
تن زنده و جان زنده ز ربطِ تن و جان است
با خرقه و سجاده و شمشیر و سنان خیز
از خوابِ گراں ، خوابِ گراں خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز!

ناموسِ ازل را تو امینی تو امینی
دارایِ جهان را تو یساری تو یمینی
ای بنده خاکی تو زمانی تو زمینی
صہبایِ یقین در کش واز دیرِ گہاں خیز
از خوابِ گراں ، خوابِ گراں خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز!

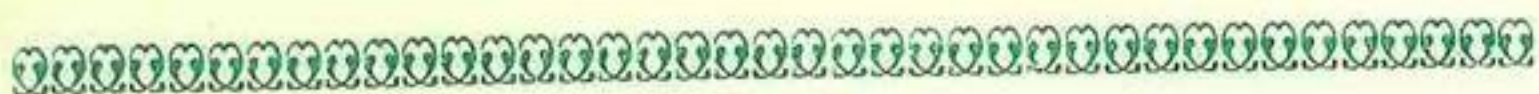




نکتہ یہی اک کاشفِ اسرارِ نہاں ہے
کشورِ تنِ خاکی ہے تو دیں روح و روان ہے
ہونگے تن و جاں زندہ جو ربطِ تن و جاں ہے
سج خرقہ و سجادہ و شمشیر و سناں سے
اٹھ خوابِ گراں ، خوابِ گراں خوابِ گراں سے
اٹھ خوابِ گراں سے !

ناموسِ ازل کا تو امیں ہے ، تو امیں ہے !
دارائے جہاں کو تو یسار اور یمیں ہے
اے بندۂ خاکی تو زماں ہے تو زمیں ہے
صہبائے یقیں نوش کر اٹھ دیرِ گہاں سے
اٹھ خوابِ گراں ، خوابِ گراں خوابِ گراں سے
اٹھ خوابِ گراں سے !

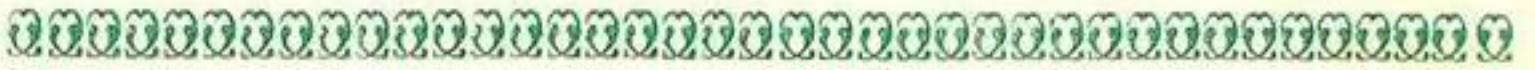




فریاد ز افرنگ و دلاویزی افرنگ
فریاد ز شیرینی و پرویزی افرنگ
عالم همه ویرانه ز چنگیزی افرنگ
معمارِ حرم ! باز به تعمیرِ جهان خیز
از خوابِ گراں، خوابِ گراں خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز!

Faint, illegible text, likely bleed-through from the reverse side of the page.





فریادِ فرنگ اور دلاویزی سے آس کی
فریاد ہے شیرینی و پرویزی سے آس کی
ویرانہ جہاں سارا ہے چنگیزی سے آس کی
معمارِ حرم ! کام لے تعمیر جہاں سے
اٹھ خوابِ گراں ، خوابِ گراں خوابِ گراں سے
اٹھ خوابِ گراں سے !



جہاں ماہمہ خاک است و پے سپر گردد
ندانم این کہ نفسہائے رفتہ بر گردد

شبے کہ گورِ غریبان نشیمن است او را
مہ و ستارہ ندارد چساں سحر گردد؟

دلے کہ تاب و تبِ لازوال می طلبد
کرا خبر کہ شود برق یا شرر گردد

نگاہِ شوق و خیال بلند و ذوق وجود
مترس ازین کہ ہمہ خاکِ رہگذر گردد

چناں بزی کہ اگر مرگِ ماست مرگِ دوام
خدا ز کردہ خود شرمسار تر گردد!

جہاں ہے خاکِ عجب کیا جو راہی ہو جائے
 نہیں خبر مجھے بیتا زمانہ لوٹ آئے

وہ شب جو گورِ غریباں پہ آکے چھائی ہے
 ہے بے ستارہ و مہ، کس طرح سحر پائے؟

جو دل ہے تاب و تبِ لازوال کا طالب
 کسے خبر وہ شرر ہو کہ برق بن جائے

نگاہِ شوق و خیالِ بلند و ذوقِ وجود
 جو خاکِ راہگزر ہوں، نہ کوئی گھبرائے

یوں جی کہ موت ہماری اگر دوامی ہے
 خدا خود اپنے کٹھے پر کمال شرمائے!

باز بر رفته و آئنده نظر باید کرد
 هله بر خیز! که اندیشه دگر باید کرد

عشق بر ناچه خویش کشد حملِ خویش
 عاشقی؟ راحله از شام و سحر باید کرد

پیر ما گفت جهان بر روشِ محکم نیست
 از خوش و ناخوش او قطع نظر باید کرد

تو اگر ترکِ جهان کرده سرِ او داری
 پس نخستین ز سرِ خویش گزر باید کرد

گفتش در دلِ من لات و منات است بس
 گفت این بتکده را زیر و زبر باید کرد

فردا و دوش کی طرف گاہ نظر چاہیے
دیکھ کہ فکر کو ترے طرزِ دگر چاہیے

اپنے ہی ناقے پہ سدا محمل۔ عشق سجتا ہے
عاشق ہے تو تو راحلہ شام و سحر چاہیے

دانا کہیں جہان کی کب رہی ایک سی روش
اچھے برے سے اس کے تو قطع نظر چاہیے

کر کے جہاں کو ترک تو طالب ہے اس کے قرب کا
پہلے خود اپنے آپ سے عزم۔ سفر چاہیے

میں نے کہا کہ دل میں ہیں لات و منات بس رہے
بولے یہ بتکدہ تو بس زیر زبر چاہیے

خیالِ من به تماشایِ آسمان بود است
بدوشِ ماه و باغوشِ کھکشان بود است

گمانِ مبر که ہمیں نھا کدان نشیمنِ ما است
کہ ہر ستارہ جہان است یا جہان بود است!

بچشمِ مورِ فرومایہ آشکار آید
ہزار نکتہ کہ از چشمِ ما نہاں بود است

زمین بہ پشتِ خود الوند و بے ستون دارد
غبارِ ماست کہ بر دوشِ او گراں بود است

ز داغِ لالہ خونینِ پیالہ می بینم
کہ این گسستہ نفسِ صاحبِ فغان بود است!

ہر دم خیال اپنا سوئے آسماں رہا
دوشِ قمر پہ یا وہ سرِ کہکشاں رہا

اس خاکداں کو اپنا نشیمن سمجھ نہ تو
ہر اختر اک جہان ہے یا اک جہاں رہا

چشمِ حقیرِ مور پر وہ آشکار ہے
ہر نکتہ جو ہماری نظر سے نہاں رہا

رکھے ہے پشت پر زمیں، الوند و لے ستوں
لیکن آسے غبار ہمارا گراں رہا

لالہ کے داغ و کاسہٴ خونیں سے ہے عیاں
یہ نیم جان بھی کبھی صاحبِ فغاں رہا

از نوابر من قیامت رفت و کس آگاه نیست
پیشِ محفل جزیم وزیر و مقام و راه نیست

در نهادم عشق با فکرِ بلند آمیختند
نا تمامِ جاودانم کارِ من چون ماه نیست

لب فروبند از فغان در ساز با دردِ فراق
عشق تا آهے کشد از جذبِ خویش آگاه نیست

شعله می باش و خاشاکے که پیش آید بسوز!
خاکیاں را در حریمِ زندگانی راه نیست

جره شاهینی بمرغانِ سرا صحبت مگیر
خیز و بال و پر کشا پروازِ تو کوتاه نیست

کرمِ شب تاب است شاعر در شبستانِ وجود
در پروبالش فروغے گاه هست و گاه نیست

در غزل اقبال احوالِ خودی را فاش گفت
ز آنکه این نو کافر از آئینِ دیر آگاه نیست

نوا سے کیا قیامت مجھ پہ ٹوٹی ، کون ہے آگاہ
کہ محفل ہو چکی محورِ ہم وزیر و مقام و راہ

میری فطرت میں عشق اور فکرِ عالی ہیں بہم دونوں
ہے میری نا تمامی جاوداں برعکسِ حالِ ماہ

فغاں لب پر نہ آئے دردِ ہجراں کو گوارا کر
جو عشق آہیں بھرے وہ جذب اپنے سے نہیں آگاہ

ہو شعلہ ، پھونک دے خاشاک جو ہو سامنے تیرے
حریمِ زندگی میں پا نہیں سکتے ہیں خاک کی راہ

تو شاہیں ہے تری مرغِ سرا سے کیوں رفاقت ہو
اڑ اپنے بال و پر سے ، تو نہیں پرواز میں کوتاہ

شبستان ہے وجود اور اس میں شاعر گویا جگنو ہے
ابھی رخشیاں ہیں بال و پر ، ابھی گم روشنی ناگاہ

غزل میں رازِ احوالِ خودی اقبال نے کھولے
کہ بتخانہ کے آئیں سے یہ نو کافر نہیں آگاہ

شرابِ میکده من نه یادگارِ جم است
 فشرده جگر من بشیشهٔ عجم است

چو موج می تپد آدم بختسجوعی وجود
 هنوز تابه کمر در میانهٔ عدم است

بیا که مثل خلیل این طلسم در شکنیم
 که جز تو هر چه درین دیر دیده ام صنم است

اگر بسینهٔ این کائنات در نروی
 نگاه را به تماشا گذاشتن ستم است

غلط خرامی ما نیز لذتی دارد
 خوشم که منزل ما دور و راه خم نجم است

تغافلے که مرا رخصت تماشا داد
 تغافل است و به از التفات دمبدم است

مرا اگر چه به بتخانه پرورش دادند
 چکید از لب من آنچه در دل حرم است!

مرے میکدہ کی صہبا نہیں یادگارِ جم ہے
یہ مرے جگر کاخوں ہے جو بہ شیشہٴ عجم ہے

رہا جستجوئے ہستی میں جوں موج بیکل انساں
مگر اب بھی یہ کمر تک تہِ پردہٴ علم ہے

آ خلیل وار ہم بھی یہ طلسم توڑ ڈالیں
یہ ہے دیر اس میں جو کچھ ہے ترے سوا، صنم ہے

نہ آتر سکے جو تیری نگہ سینہٴ جہاں میں
تو فقط نظارہ بازی تری آنکھ پر ستم ہے

یہ غلط روی ہماری بھی ہے راز دارِ لذت
میں ہوں خوش کہ دور منزل، مری راہ خمِ نجم ہے

مجھے بخش دی تغافل نے ہے رخصتِ نظارہ
یہ ہے اس نظر سے بہتر جو کریم دمبدم ہے

مری عمر گزچہ گزری ہے فضاے بتکدہ میں
وہی میرے لب پہ آیا جو غمِ دلِ حرم ہے

لالہ صحرا ایم از طرف خیابانم برید
در هوای دشت و کھسار و بیابانم برید

رو بھی آموختم از خویش و دور افتاده ام
چاره پردازاں! باغوش نیستانم برید

در میان سینه حرفے داشتم گم کرده ام
گرچه پیرم پیش ملائے دبستانم برید

ساز خاموشم نوائے دیگرے دارد هنوز
آنکہ بازم پرده گرداند پیشے آنم برید

در شب من آفتاب آں کہن داغے بس است
این چراغ زیر فانوس از شبستانم برید

من کہ رمز شهر یاری با غلامان گفته ام
بندۂ تقصیر و ارم پیش سلطانم برید

لالہ صحرا ہوں ، بیرونِ خیاباں لے چلو
مجھ کو سوئے دشت و کہسار و بیاباں لے چلو

روہی سیکھی ہے میں نے ، 'دور خود سے ہو گیا
چارہ پرداز و اٹھو ، مجھ کو نیستان لے چلو

حرف تھا اک میرے سینے میں وہ میں نے کھو دیا
پیر ہوں میں گرچہ مجھ کو پھر دبستان لے چلو

رکھتا ہے اک اور بھی نغمہ مرا سازِ خموش
مجھ کو اس کے پاس جو ہو پردہ گرداں لے چلو

میری شب کو بس مرا داغِ کہن کا آفتاب
شمع جو فانوس کے اندر ہے پنہاں لے چلو

میں نے رمزِ شہر یاری کی غلاموں کو عطا
ہو گئی تقصیر مجھ سے ، پیش سلطان لے چلو

سخن تازه زدم کس به سخن وا نرسید
جلوه خون گشت و نگاھے به تماشا نرسید

سنگ می باش و درین کار گه شیشه گزر
وای سنگے که صنم گشت و به مینا نرسید!

کهنه را در شکن و باز به تعمیر خرام
هر که در ورطهء 'لا' مانه به 'الا' نرسید

ای خوش آن جوئے تنک مایه که از ذوق خودی
در دل خاک فرو رفت و بدریا نرسید

از کلیمے سبق آموز که دانای فرنگ
جگر بحر شگافید و به سینا نرسید

عشق انداز تپیدن ز دل ما آموخت
شرر ماست که برجست و به پروانه رسید!

کوئی میرے تازہ سخن کا شناسا نہ آیا
 ہوا جلوہ خوں ، کوئی بہر تماشا نہ آیا

یہ ہے کارگہ شیشہ کی ، سنگ بن کر گزر جا
 وہ کیا سنگ جو بت بنا ، سوئے مینا نہ آیا!

مٹا دے جو کہنہ ہے ، تعمیرِ نو کا ہو بانی
 جو 'لا' کے بھنور میں رہا تا بہ 'الا' نہ آیا

وہ اچھا ہے کم آبِ نالہ جو ذوقِ خودی سے
 ہوا خاک میں جذب لیکن بہ دریا نہ آیا

سبقِ پھر کلیمی کا تو پڑھ کہ دانا فرنگی
 نے چیرا سمندر کا سینہ ، بہ سینا نہ آیا

مرے دل سے سیکھی یہ طرزِ تپشِ عشق نے بھی
 شررِ میرا اک جست میں بن کے پروانہ آیا

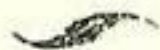
عاشق آن نیست که لب گرمِ فغانے دارد
عاشق آن است که بر کف دو جہانے دارد!

عاشق آن است کہ تعمیر کند عالمِ خویش
در نسا زد بہ جہانے کہ گرانے دارد

دلِ بیدار ندادند بہ دانائے فرنگ
این قدر هست کہ چشمِ نگرانے دارد

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار
گرچہ در کاسہ زر لعلِ روانے دارد

دردِ من گیر کہ در میکده ہا پیدا نیست
پیر مردے کہ مئے تند و جوانے دارد!



عاشق نہیں لبوں کو جو گرم۔ فغاں رکھے
عاشق ہے جو ہتھیلی پہ دونوں جہاں رکھے!

عاشق وہ جو بنائے جہاں اپنا آپ ہی
دنیا نہ وہ قبول کرے جو کراں رکھے

بیدار دل نہیں ملا دانائے غرب کو
یہ ہے کہ آنکھ کو نگراں ہر زمان رکھے

گم عشق، ڈس رہی ہے خرد آس کو مثل۔ مار
ہر چند جام زر میں یہ لعل۔ رواں ۱ رکھے

لے درد مجھ سے، میکلہوں میں اب نہ پائے گا
وہ پیر مرد، بادہ جو تند و جوان رکھے!

۱ - لعل۔ رواں - سرخ شراب



ما از خدای گم شدہ ایم او بچستجوست
چو ما نیاز مند و گرفتار آرزوست

گاہے بہ برگِ لالہ نویسد پیامِ خویش
گاہے درونِ سینہٗ مرغان بہ ہاؤ ہوست

در نرگس آرمید کہ بیند جمالِ ما
چندان کرشمہ داں کہ نگاہش بہ گفتگوست!

آہے سحر گہے کہ زند در فراقِ ما
بیرون و اندرون زبر و زیر و چار سوست!

ہنگامہ بست از پئے دیدارِ خاکئے
نظارہ را بہانہ تماشای رنگ و بوست

پنہاں بہ ذرہ ذرہ و نا آشنا ہنوز
پیدا چو ماہتاب و باغوشِ کاخ و کوست

در خاکدانِ ما گہرِ زندگی گم است
این گوہرے کہ گم شدہ مائیم یا کہ اوست!

پچھڑے ہیں ہم خدا سے ، وہ اب جستجو میں ہے
ہم سا نیاز مند ، غم۔ آرزو میں ہے

لکھتا ہے برگِ لالہ پہ اپنا کبھی پیام
سینے میں طائروں کے کبھی ہا و ہو میں ہے

نرگس کی آنکھ سے ہے ہمیں دیکھتا کبھی
ایسا کرشمہ گر ہے ، نظر گفتگو میں ہے!

بھرتا ہے آہ صبح ہمارے فراق میں
پھیلی ہوئی صدا اسی کی چار سو میں ہے!

خاک کی دید کے لیے ہنگامہ ہے یہ سب
نظارے کا بہانہ یونہی رنگ و بو میں ہے

پنہاں ہے ذرے ذرے میں ، نایاب ہے مگر
وہ مثلِ ماہ ، پہلوئے ہر کاخ و کو میں ہے

اس خاکداں میں گم ہوا ہے گوہرِ حیات
گوہر وہ ہم ہیں یا وہی جو جستجو میں ہے

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
 از جفائے ده خدایاں کشتِ دہقانان خراب
 انقلاب!

انقلاب! اے انقلاب!

شیخِ شہر از رشتہٗ تسبیح صد مومن بدام
 کافرانِ سادہ دل را برہمن ز نیاز تاب
 انقلاب!

انقلاب! اے انقلاب!

میر و سلطان نرد باز و کعبتینِ شاں دغل
 جانِ محکوماں ز تن بردند و محکوماں بخواب!
 انقلاب!

انقلاب! اے انقلاب!



۳۰

خونِ رگِ مزِ دور سے خواجہ کو حاصل لعلِ ناب
دہ خداؤں کی جفا سے کشتِ دہقانانِ خراب

انقلاب!

انقلاب! اے انقلاب!

رشتہٴ تسبیحِ شیخِ شہر میں مومنِ اسیر
گردنِ کافر پہ زنارِ برہمن کا عذاب

انقلاب!

انقلاب! اے انقلاب!

میر و سلطان نردباز اور آن کے پانسے پر فریب
جانیں محکوموں کی لیں، محکوم اب تک محوِ خواب

انقلاب!

انقلاب! اے انقلاب!





واعظ اندر مسجد و فرزند او در مدرسہ
آن بہ پیری کود کے این پیر در عہد شباب!
انقلاب!

انقلاب! اے انقلاب!

اے مسلمانانِ فغان از فتنہ ہاے علم و فن
اہرمن اندر جہاں ارزاں و یزداں دیر یاب!
انقلاب!

انقلاب! اے انقلاب!

شوخی باطل نگر! اندر کمینِ حق نشست!
شپر از کوری شبیخونے زندہ بر آفتاب!
انقلاب!

انقلاب! اے انقلاب!





خود رہا مسجد میں واعظ ، مدرسے میں ہے پسر
طفل وہ پیری میں اور یہ پیر با و صفِ شباب !

انقلاب !

انقلاب ! اے انقلاب !

اے مسلمان فتنہ ہائے علم و فن سے الا ماں
اھر من ارزاں جہاں میں اور یزداں دیریاب

انقلاب !

انقلاب ! اے انقلاب !

شوخی اس کی دیکھیے ، باطل ہے حق کی گہات میں
بے بصر شپر ہے شبخوں زن خلافِ آفتاب

انقلاب !

انقلاب ! اے انقلاب !



در کلیسا ابنِ مریم را بدار آویختند!

مصطفیٰ از کعبه هجرت کرده با ام‌الکتاب!

انقلاب!

انقلاب! اے انقلاب!

من درونِ شیشه‌هاے عصرِ حاضر دیدہ ام

آنچنان زہرے کہ ازوے مارها در پیچ و تاب!

انقلاب!

انقلاب! اے انقلاب!

با ضعیفان گاہ نیروے پانگان می دهند

شعاعاً شاید برون آید ز فانوسِ حباب!

انقلاب!

انقلاب! اے انقلاب!



ابنِ مریم کو کلیسا میں ہوئی سولی نصیب!
کعبہ سے مجبورِ ہجرت مصطفیٰ مع الکتاب!

انقلاب!

انقلاب! اے انقلاب!

عصرِ حاضر کے ہیں مینا میرے سب دیکھے ہوئے
زہر وہ ہے ان میں جس سے سانپ کھائے پیچ و تاب

انقلاب!

انقلاب! اے انقلاب!

گاہ دیتے ہیں ضعیفوں کو بھی نیروے پلنگ
وقت ہے پیدا کرے اک شعلہ فانوسِ حباب!

انقلاب!

انقلاب! اے انقلاب!



گرچہ می دانم کہ روزی بے نقاب آید بروں
تا نہ پنداری کہ جاں از پیچ و تاب آید بروں!

ضربتے باید کہ جانِ خفته بر خیزد ز خاک
نالہ کے بے زخمہ از تارِ رباب آید بروں

تاکِ خویش از گریہ ہائے نیم شب سیراب دار
کز درونِ او شعاعِ آفتاب آید بروں

ذرۂ بے مایہ ترسم کہ ناپیدا شوی
پختہ تر کن خویش را تا آفتاب آید بروں

درگزر از خاک و خود را پیکرِ خاکی مگیر
چاک اگر در سینہ ریزی ماہتاب آید بروں!

گر بروے تو حریمِ خویش را در بستہ اندر
سر بسنگِ آستانِ زن لعلِ ناب آید بروں!

اک دن وہ آئے گا کہ وہ جب بے حجاب ہو
ممکن نہیں کہ جاں کبھی بے پیچ و تاب ہو!

وہ ضرب ہو کہ سوئی ہوئی جان جاگ اٹھے
بے زخمہ کیسے نالہ زن تارِ رباب ہو

یوں اپنا تاک اپنے سرشکِ شبی سے سینچ
بر آمد اس سے روشنیِ آفتاب ہو

بے مایہ ذرہ! مٹ ہی نہ جائے ترا وجود
کر خود کو پختہ تر کہ تو خود آفتاب ہو

اٹھ خاک سے کہ تو نہیں ہے پتلا خاک کا
کر چاک سینہ تاکہ عیاں ماہتاب ہو

اپنے حریم کو اگر در بستہ وہ رکھیں
سر پھوڑ سنگِ آستان بھی لعلِ ناب ہو

کشادہ روز خوش و ناخوشِ زمانہ گزر
ز گلشن و قفس و دام و آشیانہ گزر

گرفتم این کہ غریبی و رہ شناس نہ
بکوئے دوست باندازِ محرمانہ گزر

بہر نفس کہ بر آری جہاں دگر گوں کن
دریں رباطِ کہن صورتِ زمانہ گزر

اگر عنانِ تو جبریل و حور می گیرند
کرشمہ بر دلِ شاں ریز و دلبرانہ گزر



ہنسی خوشی سے نشاط و غم۔ زماں سے گزر
 قفس سے ، دام سے ، گلشن سے آشیاں سے گزر

یہ مانا اجنبی ہے تو پہ رہ شناس نہیں
 یہ کوئے یار ہے ، انداز۔ محرماں سے گزر

نفس نفس سے نظام۔ جہاں دگرگوں کر
 زمانہ وار مقام۔ مسافراں سے گزر

کریں جو حور بھی ، جبریل بھی عنان گیری
 کرشمہ کار ہو ، انداز۔ دلبراں سے گزر



زندگی در صدفِ خویش گهرِ ساختن است
در دلِ شعله فرورفتن و نگداختن است

عشق ازین گنبدِ در بسته بروں تاختن است
شیشهٔ ماه زطاقِ فلک انداختن است

سلطنتِ نقدِ دل و دین ز کف انداختن است
به یکے دادِ جهان برودن و جان باختن است

حکمت و فلسفه را همتِ مردے باید
تیغِ اندیشه بروے دو جهان آختن است

مذهبِ زنده دلاں خواب پریشانی نیست
از همین خاکِ جهانِ دگرے ساختن است!

زندہ ہے وہ جو اپنی صدف میں ہو درہ ساز
شعلہ نشین ہو مگر پیکر نہ ہو گداز

عاشق ہے وہ جو گنبتہ بے در کے پار ہو
طاقِ فلک میں مہ سے کرے جا کے ترک تاز

ہے سلطنت کو نقدِ دل و دین سے دشمنی
آس کا ہے ایک داؤ جہاں گیر، روح باز

لازم ہے فلسفہ کے لئے مرد اک جری
یہ دو جہاں پہ فکر کو کرنا ہے ترک تاز

زندہ دلوں کا خوابِ پریشاں نہیں ہے کیش
دینا ہے یہ تو خاک سے دنیاے نو کو ساز

بروں زیں گنبدِ در بستہ پیدا کردہ ام راہے
کہ از اندیشہ بر ترمی پرد آہِ سحر گاہے

تو اے شاہیں نشیمن در چمن کردی ازاں ترسم
ہو اے اوبیالِ تو دھد پروازِ کوتاہے!

غبارے گشتہ؟ آسودہ نتوان زیستن این جا
بہ بادِ صجدم در پیچ و منشیں برسراہے

ز جوئے کہکشاں بگزر، ز نیلِ آسماں بگزر
ز منزلِ دل بمیرد گرچہ باشد منزل ماہے

اگر زان برقِ بے پروا درونِ اوتھی گردد
بچشمِ کوہِ سینا می نیرزد با پرِ کاہے

چساں آدابِ محفل را نگہ دارند و می سوزند
مپرس از ما شہیدانِ نگاہِ بر سرِ راہے

پس از من شعرِ من خوانند و دریا بند و میگویند
جمہانے را دگر گوں کرد یک مردِ خود آگاہے

نکل کر گنبدِ در بستہ سے پائی ہے میں نے راہ
کہ برتر فکر سے پرواز میں ہے آہِ صبح گاہ

بسیرا ہے چمن میں تیرا شاہیں ، مجھ کو خدشہ ہے
ہوائے باغ کر دیگی تری پرواز کو کوتاہ!

جو تو بن کر غبار آیا ، نہیں آسودگی ممکن
الجھ بادِ سحر گہ سے ، نہ بیٹھا رہ کنارِ راہ

ہو پار اس کہکشاں کی 'جو سے' نیلے آسمانوں سے
کہ مرگ دل ہے منزل خواہ منزل میں ہو سا کن ماہ

اگر آس برقِ بے پروا سے خالی ہو ضمیر آس کا
نہیں ہے طورِ سینا بھی مرے نزدیک بیش از گاہ

جلے خاموش ، پاس ان کو رہا آدابِ محفل کا
یہ گھائل آس نظر کے ہیں جو لہرائی کنارِ راہ

مرے اشعار کے خوانندہ میرے بعد سمجھیں گے
دگر گوں اک جہاں کو کر گیا اک مردِ خود آگاہ

گنہگارِ غیورم نے خدمت نمی گیرم
ازاں داغم کہ بر تقدیر او بستند تقصیرم

ز فیضِ عشق و مستی برده ام اندیشہ را آنجا
کہ از دنبالہ چشمِ مہرِ عالمتاب می گیرم

من از صبحِ نخستین نقش بندِ موج و گردابم
چو بحرِ آسودہ می گردد ز طوفان چارہ بر گیرم

جہاں را پیش ازین صد بار آتش زیر پا کردم
سکون و عافیت را پاک می سوزدیم و زیرم

ازاں پیشِ تباں رقصیدم و زناں بر بستم
کہ شیخِ شہرِ مردِ باخدا گردد ز تکفیرم!

زمانے رم کنند از من زمانے با من آمیزند
دریں صحرا نمی دانند صیادم کہ نخچیرم

دلِ بے سوز کم گیرد نصیب از صحبتِ مردے
مسِ تابیدہ آور کہ گیرد در تو اکسیرم

میں غیرت مند عاصی ہوں، نہیں بے مزد خدمت گیر
مجھے دکھ ہے مری تقصیر آس کی بن گئی تقدیر

مرا فکر اس بانندی پر ہے فیضِ عشق و مستی سے
پہنچ کر پیچھے، روئے مہر سے ہوتا ہوں دیدہ گیر

میں ہوں صبحِ ازل سے موج اور گرداب کا صانع
سمندر جب ہو آسودہ تو طوفاں سے ہوں چارہ گیر

جہاں کو میں نے مضطر کر دیا صد بار، پہلے بھی
سکون و عافیت کو برق ہے یہ میرا ہم اور زیر

ہوا پیشِ بتاں رقصاں میں اور زناں بھی باندا
کہ شیخِ شہر پائے قربِ حق، کر کے مری تکفیر

کبھی کرتے ہیں رم مجھ سے، کبھی ملتے ہیں خود آ کر
ہیں ناداں دشت کے باسی کہ ہوں صیاد یا نچیر

دل بے سوز کو بہرہ ملا کم بزمِ مرداں سے
مس تا بیدہ لے کر آ، موثر ہو میری اکسیر

جہاں کو راست و از آئینہ دل غافل افتاد است
ولے چشمے کہ بینا شد نگاہش بر دل افتاد است

شبِ تاریک و راہِ پیچ پیچ و بے یقین راہی
دلیلِ کارواں را مشکل اندر مشکل افتاد است

ز قیبِ خام سود امست و عاشقِ مست و قاصدِ مست
کہ حرفِ دایراں داراے چندین محمل افتاد است

یقینِ موسیٰ دارد گمانِ کافرے دارد
چہ تدبیراے مسلمانان کہ کارم بادل افتاد است

گہے باشد کہ کارِ ناخدائی می کند طوفان
کہ از طغیانِ موجے کشتیم بر ساحل افتاد است

جہاں ہے بے بصر اور دل کے آئینے سے غافل ہے
یہاں جو آنکھ بیٹا ہے ، اسی کے سامنے دل ہے

اندھیری رات ، رہ پُر پیچ ہے اور بے یقین راہی
نقیبِ کاروان کے واسطے مشکل پہ مشکل ہے

رقیبِ خام سودا مست و عاشق مست و قاصد مست
کہ حرفِ دلبران مقصودِ گونا گوں کا حامل ہے

یقین مومن کا رکھتا ہے ، گماں کافر کا رکھتا ہے
ہو چارہ مومنواب کیا مری مشکل مراد دل ہے

کبھی کرتا ہے کارِ ناخدائی آپ ہی طوفان
ملا اک موجِ سرکش سے مری کشتی کو ساحل ہے



نمی دانم که داد این چشم بینا موج دریا را
گهر در سینه دریا حریف بر ساحل افتاد است

نصیبی نیست از سوز درونم مرز و بومم را
زدم اکسیر را بر خاک صحرا باطل افتاد است

اگر در دل جهان تازه داری برون آور
که افرنگ از جراحی ها پنهان بسمل افتاد است!





نہ جانے چشمِ بینا پائی کس سے موجِ دریا نے
گہرِ دریا کے سینے میں، خزفِ برروے ساحل ہے

مرے سوزِ دروں سے کچھ نہ پایا میری بستی نے
مری اکسیر کا مصرفِ بخاکِ دشتِ باطل ہے

اگر تازہ جہاں رکھتا ہے دل میں، کر عیاں آس کو
کہ افرنگِ انِ جراحتِ ہائے پنہاں ہی سے بسمل ہے



نہ یابی در جہاں یارے کہ داند دلنوازی را
 بخود گم شونگہ دار آبروے عشق بازی را

من از کار آفرین داغم کہ با این ذوق پیدائی
 زما پوشیدہ دارد شیوہ ہائے کا سازی را

کسے این معنی نازک نداند جز ایاز این جا
 کہ مہر غزنوی افزوں کند درد ایازی را

من آن علم و فراست با پر کا ہے نمی گیرم
 کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مرد غازی را!

بہر نرخے کہ این کالا بگیری سودمند افتد
 بزور بازوے حیدر بدہ ادراک رازی را

اگر یک قطرہ خون داری اگر مشت پرے داری
 بیا من با تو آموزم طریق شاہبازی را

اگر این کار را کار نفس دانی چہ نادانی!
 دم شمشیر اندر سینہ باید نے نوازی را!

کہاں محبوب دنیا میں جو سمجھے دلنوازی کو
خود دی میں گم ہو، رکھ لے آبروئے عشق بازی کو

گلہ خالق سے یہ ہے خود نمائی کا وہ رسیا ہے
نہاں رکھتا ہے ہم سے شیوہ ہائے کار سازی کو

فقط جانے ایازِ اس کو ز بس نازک ہیں یہ معنی
فزون کرتی ہے مہر۔ غزنوی دردِ ایازی کو

خریدوں میں نہ وہ علم و فراست ایک تنکے میں
جو بے گانہ کرے تیغ و سپر سے مردِ غازی کو

منافع کا ہے سودا جس بھی قیمت پر ملے تجھ کو
عوض میں بازوئے حیدر کے دے ادراکِ رازی کو

میسر ہوں تجھے گر قطرہٴ خوں اور مشتِ پر
مرے پاس آکے حاصل کر طریقِ شاہبازی کو

تو ناداں ہے اگر اس کام کو کارِ نفس سمجھا
دمِ شمشیر سینے میں ہے لازم نے نوازی کو

علمے کہ تو آموزی مشتاقِ نگاہے نیست
واماندهٔ راہے هست ، آوارۂ راہے نیست

آدم کہ ضمیرِ او نقشِ دو جہاں ریزد
بالذتِ آہے هست ، بے لذتِ آہے نیست !

ہر چند کہ عشقِ او را آوارۂ راہے کرد
داغے کہ جگر سوزد در سینۂ ماہے نیست

من چشمِ نہ بردارم از روئے نگارینش
آن مستِ تغافلِ را توفیقِ نگاہے نیست !

اقبالِ قبا پوشد در کارِ جہاں کوشد
دریاب کہ درویشی با دلق و کلاہے نیست !

وہ علم جو تو نے سیکھا ہے مشتاق نگاہ نہیں ہوتا
واماندہ راہ تو ہوتا ہے ، آوارہ راہ نہیں ہوتا

وہ آدم جسکا قلب ہوا ہے نقش طرازِ ہر دو جہاں
ہو لذتِ آہ تو ہوتا ہے ، بے لذتِ آہ نہیں ہوتا !

ہر چند کہ ہے سرگرداں وہ اس عشق کے ہاتھوں راہوں میں
مسکن اک داغِ جگر سوزاں کا سینہٴ ماہ نہیں ہوتا

اٹھتی ہی نہیں ہے پل بھر بھی اس روئے نگار سے میری نظر
رہتا ہے وہ مستِ تغافل ہی ، مائل بہ نگاہ نہیں ہوتا

اقبال قبا پوشاں^۱ بھی رہا اور کارِ جہاں میں کوشاں بھی
لازم درویشی کو خالی یہ دلق و کلاہ نہیں ہوتا

۱ اس ترکیب میں ارادۃً تصرف سے کام لیا گیا ہے

چوں خورشیدِ سحر پیدا نگاہے می توان کردن
 ہمیں خاکِ سیہ را جاوہ گاہے می توان کردن

نگاہِ خویش را از نوکِ سوزن تیز تر گردان
 چو جوهر در دلِ آئینہ راہے می توان کردن

دریں گلشن کہ بر مرغِ چمن راہِ فغان تنگ است
 باندازِ کشودِ غنچہ آہے می توان کردن

نہ این عالم حجاب اورا نہ آن عالم نقاب اورا
 اگر تابِ نظر داری نگاہے می توان کردن

”تو در زیرِ درختان همچو طفلانِ آشیان بینی“
 بہ پرواز آ کہ صیدِ مہر و ماہے می توان کردن

جو تو چاہے تو خورشیدِ سحر سی ہے نگاہ آساں
اسی خاکِ سیہ سے پیدا کرنا جلوہ گاہ آساں

اگر ہوں نوکِ سوزن سے نگاہیں تیز تر تیری
دلِ آئینہ میں جو ہر صفت پانا ہے راہ آساں

ہے گر راہِ فغاں مرغِ چمن پر تنگ گلشن میں
کشودِ غنچہ کے انداز سے ہے ایک آہ آساں

نہ یہ عالمِ حجابِ آس کو نہ وہ عالمِ نقابِ آس کو
جو ہو تابِ نظرِ تجھ میں تو ہوتی ہے نگاہ آساں

درختوں کے تلے تو مثلِ طفلانِ اشیاں چاہے
سرِ پروازِ آغافل ، ہے صیدِ مہر و ماہ آساں

کشیدی بادہا در صحبتِ بیگانه پے در پے
بنورِ دیگران افروختی پیمانہ پے در پے

ز دستِ ساقیِ خاور دو جامِ ارغوان در کش
کہ از خاکِ تو خیزد نالہٴ مستانہ پے در پے

دلے کو از تب و تابِ تمنا آشنا گردد
زند بر شعلہ خود را صورتِ پروانہ پے در پے

ز اشکِ صبحگاہی زندگی را برگ و ساز آور
شود کشتِ تو ویرانہ گرنہ ریزی دانہ پے در پے

بگردان جام و از ہنگامہٴ افرنگ کمتر گو
ہزاران کاروان بگزشت ازین ویرانہ پے در پے!

تو مے آشام ہے در صحبتِ بیگانہ پے در پے
فروزاں نورِ غیراں سے کیا پیمانہ پے در پے

دو جامِ ارغواں لے ساقیٰ خاور کے ہاتھوں سے
تری مٹی سے اٹھے نالہٴ مستانہ پے در پے

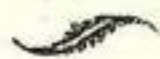
تب و تاب تمنا سے شناسائی ہو جس دل کو
ہے گرتا شعلہ پر خود صورتِ پروانہ پے در پے

کراشک صبحگاہی سے تو ساماں زندگانی کا
تری کھیتی ہو ویراں گر نہ ڈالے دانہ پے در پے

نہ کر ہنگامہٴ مغرب کا ذکر، اب جامِ گرداں کر
ہزاروں کارواں دیکھے ہے یہ ویرانہ پے در پے!

عشق اندر جستجو افتاد و آدم حاصل است
 جلوہ او آشکار از پردہ آب و گل است

آفتاب و ماه و انجم می توان دادن ز دست
 در بہائے آن کفِ خاکے کہ دارائے دل است



رہا ہے جستجو میں عشق ، انساں آس کا حاصل ہے
 ہے جلوہ آشکار آس کا کہ زیرِ پردہ گل ہے

جو سورج چاند تارے دے کے ہاتھ آئے تو ارزاں ہے
 وہ مشتِ خاک جس میں ایک جیتا جاگتا دل ہے



بیا کہ خاوریاں نقشِ تازہ بستند
دگر مر و بطوافِ بتے کہ بشکستند

چہ جلوہ ایست کہ دلہا بلذتِ نگہمے
ز خاکِ راہ مثالِ شرارہ برجستند!

کجاست منزلِ تورانیانِ شہر آشوب
کہ سینہ ہائے خود از تیزیِ نفسِ خستند

تو ہم بدوقِ خودی رس کہ صاحبانِ طریق
بریدہ از ہمہ عالم بخویش پیوستند

بچشمِ مردہ دلاں کائنات زندانے است
دو جامِ بادہ کشیدند و از جہاں رستند

غلامِ ہمتِ بیدارِ آن سوارانم
ستارہ را بسناں سفتہ در گرہ بستند

فرشتہ را دگر آن فرصتِ سجود کجاست
کہ نوریاں بتماشائے خاکیان مستند!

ادھر آ ، اہلِ خاور نے کیا ہے نقشِ نو پیدا
شکستہ ہو چکا جو بت ، نہ کراب تو طوافِ آس کا
وہ کیا جلوہ ہے جس کی اک جھلک پانے کو لپکے ہیں
روش کی خاک سے مشتاق دل اٹھ کر شررِ آسا
نہ جانے اب ہیں کس منزل میں شہرِ آشوبِ تورانی
نفس کی تیزیوں سے جن کے سینوں میں لگا چرکا
خودی کا ذوق پیدا کر ، طریقت کے جیالوں نے
سدا دنیا سے توڑا اور جوڑا خود سے ہمے ناتا
جو مردہ دل ہیں دنیا کو وہ اک زنداں سمجھتے ہیں
چڑھائے جامِ دو اور پا گئے دنیا سے چھٹکارا
میں بندہ ہمتِ بیدار کا ہوں آنِ سواروں کی
ستاروں کو سنانوں میں پرو کر جو کریں یکجا
کہاں فرصت فرشتے کو کہ پھر مشغولِ سجدہ ہو
نظرِ خاکی پہ ہے ، نوری ہوا ہے مستِ نظارا!

عشق را نازم کہ بودش را غم نا بود نے
کفرِ او ز نازِ دارِ حاضر و موجود نے

عشق اگر فرماں دہد از جانِ شیریں ہم گزر
عشق محبوب است و مقصود است و جان مقصود نے!

کافری را پختہ تر سازد شکستِ سومنات
گرمی بتخانہ بے ہنگامہ محمود نے

مسجد و میخانہ و دیر و کلیسا و کنشت
صدفسوں از بہر دل بستند و دل خوشنود نے

نغمہ پردازی ز جوئے کوهسار آموختم
در گلستان بودہ ام یک نالہ درد آلود نے

پیش من آئی؟ دمِ سردے دلِ گرمے بیار
جنبشِ اندر تست اندر نغمہ داؤد نے

عیبِ من کم جوئے و از جامم عیارِ خویش گیر
لذتِ تلخابِ من بے جانِ غم فرسود نے

عشق نازاں ہے کہ اس کو غم۔ نابود نہیں
کافری عشق کی زناریؑ موجود نہیں

عشق اگر کہہ دے تو کر جان کو بھی اپنی نثار
عشق مقصود ہے یہ جان تو مقصود نہیں !

سو منات آجڑے تو یہ کافری پختہ تر ہے
گرمئی بتکدہ بے شورش۔ محمود نہیں

مسجد و میکدہ و دیر و کلیسا و کنشت
سو جتن دل کے لیے دل ہے کہ خوشنود نہیں

جوئے کہسار سے لی میں نے یہ نغمہ ریزی
ایک فریاد بھی گلشن میں غم آلود نہیں

میری مجلس میں دم۔ سرد، دلِ گرم کو لا
تو ہی خود جنبش ہے یہ نغمہٴ داود نہیں

عیب مت گن تو بنا جام مرا اپنا عیار
میرا تلخاب بجز جانِ غم آلود نہیں

بر دلِ بے تابِ من ساقیِ مئے نالے زند
 کیمیا ساز است و اکسیرے بہ سیہائے زند

من نہ دانم نور یا نار است اندر سینہ ام
 این قدر دانم بیاضِ او بہ مہتائے زند

بر دلِ من فطرتِ خاموش می آرد ، ہجوم
 ساز از ذوقِ نوا خود را بمضرائے زند

غم مخور ناداں کہ گردوں در بیابانِ کم آب
 چشمہ ہا دارد کہ شبخونے بہ سیلایے زند!

اے کہ نوشم خور دہ، از تیزیِ نیشم مرنج
 نیش ہم باید کہ آدم را رگِ خوائے زند

ڈالی ساقی نے مئے خالص دلِ بے تاب پر
 کیمیا گر ڈالتا اکسیر ہے سیلاب پر

کیا خبر سینے میں میرے نور ہے یا نار ہے
 اس کی بے داغی ہے چشمک زن ہوئی مہتاب پر

میرے دل پر فطرتِ خاموش کرتی ہے ہجوم
 ساز خود ذوقِ نوا سے گر گیا مضراب پر

غم نہ کر ناداں، فلک کے فیض سے دشتِ کم آب
 رکھتا ہے چشمے جو شبخوں کر سکیں سیلاب پر

نوش خوارو، شکوہ کیسا میرے نیشِ تیز کا
 نیش ہے درکار آدم کے وریدِ خواب پر

فروغِ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے!
 زمیں از کوکبِ تقدیرِ ما گردوں شود روزے!

خیالِ ما کہ او را پرورش دادند طوفانها
 ز گردابِ سپهرِ نیلگون بیرون شود روزے

یکی در معنی آدم نگر! از من چہ می پرسی
 هنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے

چنان موزوں شود این پیش پا افتاد مضمونے
 کہ یزداں را دل از تاثیر او پر خوں شود روزے

تابِ خاکِ ہوگی نوری سے بھی افزوں ایک دن!
کو کبِ آدم سے ہوگی ارض، گردوں ایک دن!

پالا طوفانوں نے جس کو، وہ خیالِ انسان کا
ہو گا گردابِ یمِ گردوں سے بیروں ایک دن

دیکھ آدم کی حقیقت، پوچھتا ہے مجھ سے کیا
کہلتا ہے فطرت کو اب تک، ہوگا موزوں ایک دن

موزوں ہو جائیگا یہ فرسودہ مضمون اس طرح
ہوگا اس کے کیف سے یزداں کا دل خوں ایک دن



ز رسم و راهِ شریعت نکرده ام تحقیق
جز اینکه منکرِ عشق است کافرو ز ندیق!

مقامِ آدمِ خاکی نهاد دریا بند
مسافرانِ حرم را خدا دهد توفیق

من از طریق نه پرسم ، رفیق می جویم
که گفته اند نخستین رفیق و باز طریق

کند تلافی ذوق آن چنان حکیمِ فرنگ
فروغِ باده فزوں تر کند بجامِ عقیق

هزار بار نکو تر متاعِ بصری
ز دانشی که دل او را نمی کند تصدیق

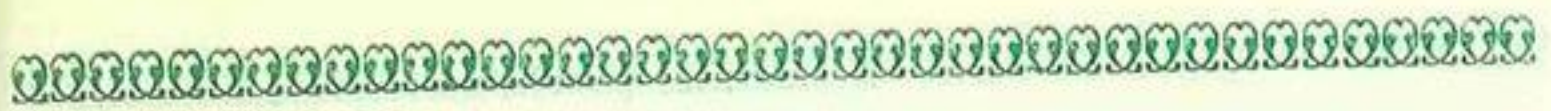
جو رسم و راہ شریعت کی میں نے کی تحقیق
 کھلا کہ عشق کا منکر ہے کافرو ز ندیق!

مقامِ آدمِ خاکی نہاد تک ہوں رسا
 مسافرانِ حرم کو خدا دے یہ توفیق

نہیں طریق کا طالب ، رفیق کی ہے طلب
 کہا گیا ہے کہ اول رفیق و بعد طریق

تلافی ذوق کی کرتا ہے یوں حکیمِ فرنگ
 فروغِ بادہ بڑھاتا ہے دے کے جامِ عقیق

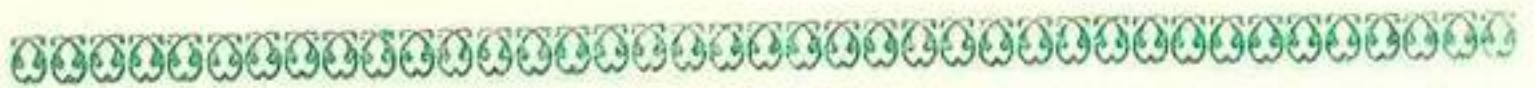
ہزار بار ہے بہتر متاعِ بے بصری
 اس علم سے کہ نہ دل جس کی کر سکے تصدیق



۲۲۷
به پیچ و تاب خرد گرچه لذتِ دگر است
یقینِ ساده دلاں به ز نکته های دقیق

کلام و فلسفه از لوحِ دل فروشتم
ضمیرِ خویش کشادم به نشترِ تحقیق

ز آستانهٔ سلطان کناره می گیرم
نه کافر م که پرستم خدائے بی توفیق!





گو پیچ و تاب خرد میں بھی ہے سرور بہت
یقینِ سادہ دلاں برتر از نکاتِ دقیق

کلام و فلسفہ سے لوحِ دل کو پاک کیا
ہوا ضمیر کشا میرا نشترِ تحقیق

میں آستانہٴ سلطان سے دور دور رہا
یہ کافری ہے کہ پوجوں خدائے بے توفیق!



از همه کس کناره گیر صحبت آشنا طلب
هم ز خدا خودی طلب هم ز خودی خدا طلب

از خلش کرشمه کار نمی شود تمام
عقل و دل و نگاه را جلوه جدا جدا طلب

عشق بسر کشیدن است شیشه کائنات را
جام جهان نما مجو دست جهان کشا طلب

راه روان برهنه پا راه تمام خارزار
تابه مقام خود رسی راحله از رضا طلب!

چون به کمال می رسد فقر دلیل خسروی است
مسند کیقباد را در ته بوریا طلب

پیش نگر که زندگی راه بعالمی برد
از سر آنچه بود و رفت در گذر، انتها طلب

ضربت روزگار اگر ناله چو ناله دهد ترا
باده من ز کف بنه، چاره ز مومیا طلب

ہو کے الگ جہان سے کر صحبتِ آشنا طلب
بزدان سے کر خودی طلب اور ہو خودی خدا طلب

ایک کرشمہ سے فقط ہو گا نہ کامیاب تو
عقل و دل و نظر کے ہوں جلوے جدا جدا طلب

شیشہ کائنات میں قطرہ نہ چھوڑنا ہے عشق
جامِ جہاں نگر کو تاج، دستِ جہاں کشا طلب

راہی برہنہ پا ہیں سب، راہ تمام خار زار
منزل کی ہے لگن تو کر راحلہ رضا طلب!

پہنچا کمال تک تو ہے فقر دلیلِ خسروی
مسندِ کیتباد کو کر تہِ بوریا طلب

آگے کو دیکھ، زندگی اور جہاں کا ہے نشان
چھوڑ، جو تہا اور اب نہیں، حق سے کر انتہا طلب

زخمہ روزگار دے نالہ جوں نے تجھے اگر
رکھ دے مرا پیالہ، کر چارہ مومیا طلب

بینی جہاں را ، خود را نہ بینی
تا چند نادان غافل نشینی؟

نورِ قدیمی شب را بر افروز
دستِ کلیمی در آستینی!

بیرون قدم نہ از دورِ آفاق
تو پیش ازینی تو بیش از ازینی!

از مرگ ترسی اے زندہ جاوید؟
مرگ است صیدے تو در کمینی

جا نے کہ یخشند دیگر نگیرند
آدم بمیرد از بے یقینی

صورت گری را از من بیا موز

شاید کہ خود را باز آفرینی!

جہاں ہیں ہے لیکن تو خود ہیں نہیں ہے
تو نادان ہے مدت سے غفلت نشین ہے

تو نورِ ازل ہے ، شبِ افروز ہو جا
یدِ بیضا رکھتی تری آستین ہے !

نکل دورِ آفاق کے چکروں سے
تو پہلے ہے اس سے ، بڑا بھی کہیں ہے !

نہ خائف ہو مرنے سے تو جاوداں ہے
ترا صید ہے مرگ ، تو در کہیں ہے

عطا کر دیں جب جاں نہیں لیتے واپس
وہ بے جان انسان ہے جو بے یقین ہے

یہ صورت گری فن ہے ، آ سیکھ مجھ سے
کہ شاید تو خود اپنا باز آفریں ہے

من ، هیچ نمی ترسم از حادثه شبها
شبها که سحر گردد از گردشِ کوکب ها!

شناخت مقامِ خویش ، افتاد بدامِ خویش!
عشقم که نمودم خواست از شورشِ یارب ها!

آه که ز دل خیزد از بهرِ جگر سوزی است
در سینه شکن او را آلوده مکن لب ها

در میکده باقی نیست از ساقیِ فطرت خواه
آن مے که نمی گنجد در شیشه مشرب ها

آسوده نمی گردد آن دل که گسست از دوست
با قرأتِ مسجد ها بادانشِ مکتب ها!

ڈروں اس حادثہ سے کیوں ، بپا ہوتا ہے جو شب سے
سحر ہو جاتی ہے ہر شب ، فقط دورانِ کوکب سے

وہ جانے کیا مقام اپنا ، ہے گھیرے آس کو دام اپنا
نمود اپنی جو چاہے عشق ہر دم وردِ یا رب سے

جو دل سے آہ اٹھتی ہے ، جگر سوزی کی خاطر ہے
رہے سینہ کے اندر ہی ، نہ ابھرے وہ کبھی لب سے

نہیں میخانہ میں باقی ، تجھے دے ساقی فطرت
وہ بادہ جو اچھل جائے ہر اک میناے مشرب سے

جدا ہو کر نگاراں سے دل آسودہ نہیں ہوتا
قرأت مسجدوں سے ہو کہ دانش لائیں مکتب سے !

تو کیستی؟ ز کجائی؟ که آسمانِ کبود
هزار چشمِ براهِ تو از ستاره کشود!

چه گوئمت که چه بودی چه کرده، چه شدی
که خون کند جگرم را ایازی محمود!

تو آن نه، که مصائب ز کمکشان میکرد
شرابِ صوفی و شاعر ترا ز خویش ربود

فرنگ اگر چه ز افکارِ تو گره بکشاد
بجرعه دگرے نشه ترا افزود

سخن ز نامه و میزبان دراز تر گفتی
بحیرتم که نه بینی قیامتِ موجود

خوشا کسے که حرم را درون سینه شناخت
دمے تپید و گزشت از مقامِ گفت و شنود

ازان بمکتب و میخانه اعتبارم نیست
که سجده نبرم بر درِ جبین فرسود!

کہاں سے ، کون ہے 'تو ، جانتا ہے چرخِ کبود
 ہوئی ہے دیدۂ انجم کی تیری رہ پہ کشود!

تو کیا سے کیا ہوا ، کیسے ہوا ، کہوں میں کیا
 جگر مرا ہوا خون ، اب ایاز ہے محمود!

تھا وہ بھی وقت ، مصلیٰ تھا کہکشاں تیرا
 شرابِ صوفی و شاعر نے لوٹا تیرا وجود

گرہ کشا ترے افکار کا فرنگ ہوا
 پھر ایک جرعہ سے گزرا تو مستیوں کے حدود

کیا ہے نامہ و میزاں کا تو نے ذکر طویل
 تری نظر میں نہیں کیوں قیامتِ موجود

خوشا وہ جس نے حرم اپنے سینے میں پایا
 تڑپ کے کر گیا طے وہ مقامِ گفت و شنود

بھروسہ مکتب و میخانہ پر نہیں ہے مجھے
 نہیں ہے سجدہ کو شایاں درِ جبیں فرسود!

دیارِ شوق کہ دردِ آشناست خاکِ آنجا
بذرہ ذرہ تو اوں دید جانِ پاکِ آنجا

مٹے مغانہ ز مغ زادگان نمی گیرند
نگاہ می شکنند شیشہ ہائے تاکِ آنجا!

بہ ضبطِ جوشِ جنوں کوش در مقامِ نیاز
بہوش باش و مرو با قبائے چاکِ آنجا!



دیارِ شوق کہ درد آشنا ہے خاک وہاں
 ہر ایک ذرہ میں ظاہر ہے جانِ پاک وہاں

مٹے مغان نہیں لیتے ہیں مغِ بچوں سے کبھی
 نظر سے ٹوٹتے ہیں شیشہ ہائے تاک وہاں!

نیاز کا ہے تقاضا ، ہو ضبطِ جوشِ جنوں
 سنبھال ہوش ، نہ لے جا قبائے چاک وہاں!



مثنیٰ دیرینه و معشوق جوان چیزے نیست
پیش صاحب نظران حور و جنان چیزے نیست

هر چه از محکم و پاینده شناسی گذرد
کوه و صحرا و بر و بحر و کراں چیزے نیست

دانشِ مغربیاں ، فلسفہٴ مشرقیاں
همہ بتخانہ و در طوفِ بتان چیزے نیست

از خود اندیش و ازیں بادیہ ترساں مگذر
کہ تو هستی و وجودِ دو جہاں چیزے نیست

در طریقےٴ ۱ کہ بنوکِ مژہ کاویدم من
منزل و قافلہ و ریگِ رواں چیزے نیست!

مٹے دیرینہ و معشوقِ جوان کچھ بھی نہیں
 اہل دیدہ کے لئے حور و جنان کچھ بھی نہیں

جس کو تو سمجھا ہے پابندہ ، ہے فانی یکسر
 کوہ و صحرا و برو بحر و کراں کچھ بھی نہیں

دانشِ مغربیاں ، فلسفہٴ مشرقیاں
 سب ہی بتخانے ہیں یہ طوفِ بتان کچھ بھی نہیں

ہو خود اندیش اور اس دشت سے بے خوف گزر
 کہ فقط تو ہے ، وجودِ دو جہاں کچھ بھی نہیں

راستہ طے جو کیا نوکِ مژہ سے ، اس میں
 منزل و قافلہ و ریگ رواں کچھ بھی نہیں!

قلندران که به تسخیر آب و گل کوشند
 ز شاه باج ستانند و خرقة می پوشند

بجلوت اند و کمندے به مهر و ماه پیچند
 بخلوت اند و زمان و مکان در آغوشند!

بروز بزم سراپا چو پرنیان و حریر
 بروز رزم خود آگاه و تن فراموشند

نظام تازه پرخ دو رنگ می بخشند
 ستاره های کهن را جنازه بر دوشند!

زمانه از رخ فردا کشود بند نقاب
 معاشراں همه سر مست باده دوشند

بلب رسید مرا آن سخن که نتوان گفت
 بحیرتم که فقیمهان شهر خاموشند!

قلندر رہتے ہیں تسخیر آب و گل میں پیہم کوش
وہ شہ سے باج لیتے ہیں مگر ہوتے ہیں خرقہ پوش

کمندیں پھینکتے ہیں مہر و مہ پر جب ہوں جلوت میں
ہیں خلوت میں زمانوں اور مکانوں کے لئے آغوش

ہوں بزم آرا تو مثل پر نیاں وہ نرم ہوتے ہیں
ہوں رزم آرا تو خود آگہ مگر تن کا نہ رکھیں ہوش

نظامِ نو عطا کرتے ہیں افلاکِ دو گونہ کو
وہ فرسودہ ستاروں کے جنازے ہیں لئے بردوش!

زمانے نے نقاب الٹی رخِ زیبائے فردا سے
مرے ہمسر مگر اب تک ہیں سرمستِ شرابِ دوش

مرے لب پر وہ بات آئی جسے کہنا نہیں ممکن
میں حیراں ہوں فقیہِ شہر ہے کس واسطے خاموش

دو دسته تیغ و گردون برهنه ساخت مرا
فسان کشید و بروی زمانه آخت مرا

من آن جهان خیالم که فطرت ازلی
جهان بلبل و گل را شکست و ساخت مرا

مئے جوان که به پیمانہ تو می ریزم
ز راوقے است که جام و سبو گداخت مرا

نفس به سینه گدازم که طائرِ حرمم
توان ز گرمئی آواز من شناخت مرا

شکست کشتی ادراکِ مرشدانِ کهن

خوشا کسے که بدریا سفینه ساخت مرا!

میں ہوں تیغِ دو دستہ جسکو گردوں نے کیا عریاں
لگایا سان پر مجھ کو ، اٹھایا پھر سرِ دوراں

ہوں وہ عالم خیالوں کا ، ازل میں دستِ فطرت نے
جہانِ بلبلی و گل توڑ کر میرا کیا سامان

ترے ساغر میں میں نے جو مے نو خیز ڈالی ہے
گداز آس نے کیے ہیں میرے جام و مینا ، شعلہ ساں

میں طائر ہوں حرم کا ، ہے نفس سیال سینے میں
مری آواز کی گرمی سے ہوتا ہے مرا عرفاں

پرانے مرشدوں کی کشتی ادراک ٹوٹی ہے
خوشا وہ جو سفینے کو مرے دریا میں ہے گرداں!

مثل شرر ذره را تن به تپیدن دهم
تن به تپیدن دهم ، بال پریدن دهم!

سوزِ نوایم نگر ! ریزه الماس را
قطره شبنم کنم خوئے چکیدن دهم!

چوں ز مقام نمود نغمه شیرین زخم
نیم شبان صبح را میل دمیدن دهم!

یوسف گم گشته را باز کشودم نقاب
تابه تنک ما یگان ذوق خریدن دهم!

عشقِ شکیب آرزو ما خاک ز خود رفته را
چشم ترے داد و من لذت دیدن دهم!

میں ذرے کو شرر صورت ، تپش کا ساز دیتا ہوں
دلِ بے تاب دیتا ہوں ، پر پرواز دیتا ہوں

مرے سوزِ نوا سے ریزۂ الماس پانی ہے
میں جوں شبنم تراوش کا آسے انداز دیتا ہوں

مقامِ خود نمائی سے جو نغمہ ریز ہوتا ہوں
سحر کو نیم شب پر تاخت کا اعجاز دیتا ہوں

اٹھایا میں نے روئے یوسفِ گم گشتہ سے پردہ
میں بے زر کو خریداری کا ذوق و ساز دیتا ہوں

دیا ہے عشق نے جو دیدۂ تر خاکِ بے خود کو
میں اس کو لذتِ چشمِ نظارہ باز دیتا ہوں

خودی را مردم آمیزی دلیل نارسائی ها!
تو اے درد آشنا بیگانه شواز آشنائی ها!

بدرگاہِ سلاطین تا کجا این چہرہ سائی ها
بیا موز از خدائے خویش نازِ کبریائی ها!

محبت از جوانمردی بجائے می رسد روزے
کہ افتد از نگاہش کاروبارِ دلربائی ها!

چنان پیشِ حریمِ او کشیدم نغمہٴ دردے
کہ دادم محرمان را لذتِ سوزِ جدائی ها!

ازاں برخویش می بالم کہ چشمِ مشتری کوراست
متاعِ عشقِ نا فرسوده ماند از کمِ روائی ها

بیا بر لالہ پا کو بیم و بیباکانہ مے نوشیم
کہ عاشق را بجل کردند خونِ پا رسائی ها

بروں آ از مسلمانان گریز اندر مسلمانانی
مسلمانان روا دارند کافر ماجرائی ها!

خودی کی مردم آمیزی نشان ہے نارسائی کا
تو اے درد آشنا ، بیگانہ نہ ہو ہر آشنائی کا

رہے گی درگہِ سلطان میں کب تک یہ جبیں سائی
سبق پڑھ خود خدا اپنے سے نازِ کبریائی کا

جواں مردی دلائلیگی محبت کو مقام اپنا
نظر سے اُس کی گر جائے گا شیوہ دلربائی کا

حریمِ دوست کے باہر وہ میرا درد کا نغمہ
مزا سب محرموں کو دے گیا سوزِ جدائی کا

میں شاداں ہوں کہ میرے مشتری تھے نے بصر سارے
متاعِ عشق سالم ہے ، گلہ کیا کم روائی کا

کریں ہم رقصِ لالہ پر ، ہوئے باکانہ سے نوشی
کہ عاشق کے لیے جائز ہے یہ خوں پارسائی کا

مسلمانوں کو تج کر آ ، مسلمانی میں داخل ہو
مسلمان ہو چکا گرویدہ کا فر ما جرائی کا

چوں چراغ لاله سوزم در خیابان شما
 اے جوانانِ عجم جانِ من و جانِ شما!

غوطه ها زد در ضمیرِ زندگی اندیشه ام
 تا بدست آورده ام افکارِ پنهانِ شما

مهر و مه دیدم نگاهم برتر از پروین گزشت
 ریختم طرحِ حرم در کافرستانِ شما!

تا سنانش تیز تر گردد فرو پیچیدمش
 شعله آشفته بود اندر بیابانِ شما

فکرِ رنگینم کند نذرِ تہی دستانِ شرق
 پارہ لعلی کہ دارم از بدخشانِ شما

می رسد مردے کہ زنجیرِ غلامان بشکندر
 دیدہ ام از روزنِ دیوارِ زندانِ شما

حلقه گردِ من ز نید اے پیکرانِ آب و گل
 آتشی در سینه دارم از نیاگانِ شما!

چراغ لالہ ہوں ، زینت تمہارے ہی خیاباں کی
عجم والو ! قسم مجھ کو تمہاری اور مری جاں کی !

ضمیرِ زندگی میں فکر میرا دور تک اُترا
مرے ہاتھ آئی تب دولت تمہارے فکرِ پنہاں کی

نظر میں مہر و مہ آئے نگہ پرویں سے گزری ہے
حرم کردی زمیں میں نے تمہارے کافرستاں کی !

میں لپٹا آس سے تاکہ نوک اس کی تیز تر کردوں
تھی آشفته تمہاری لو ، تھی پالی گو بیاباں کی

دیا مشرق کے ناداروں کو میرے فکرِ رنگیں نے
وہ لعل اک جو امانت تھا تمہارے ہی بدخشاں کی

وہ آنے کو ہے توڑے گا جو زنجیریں غلاموں کی
خبر یہ ہے تمہارے روزنِ دیوارِ زنداں کی

مرے حلقہ میں آؤ ، پیکرانِ آب و گل مل کر
میرے سینے میں آتش ہے تمہارے ہی نیاگان کی !

دم مرا صنعت باد فرو دین کردند
گیاه راز سر شکم چو یاسمین کردند

نمود لاله صحرا نشین ز خوننام
چنانکه باده لعلی بساتگیں کردند

بلندبال چنانم که بر سپهر برین
هزار بار مرا نوریان کمین کردند

فروغ آدم خاکی ز تازه کاری هاست
مه وستاره کنند آنچه پیش ازین کردند

چراغ خویش بر افروختم که دست کلیم
درین زمانه نهان زیر آستین کردند

در آبسجده و یاری ز خسروان مطلب
که روز فقر نیاگان ما چنین کردند

نفس بخشا گیا مجھ کو ، ہو بادِ فرودیں جیسے
 کرشمہ میرے اشکوں کا ، گیا ہو یاسمیں جیسے

مرے خونناب سے نکھری نمودِ لالہٴ صحرا
 شرابِ لعل گوں سے ہو بھرا اک ساتگیں ۲ جیسے

مری پرواز کی رفعت سے نوری ہو کھلائے ہیں
 چھپا دیکھا ہے آن کو بارہا بہرہ کمیں جیسے

عمل کی تازگی سے ہے فروغِ آدمِ خاکی
 لگے ہیں اک ڈگر پر ماہ و اختر ہوں مکیں جیسے

چراغ اپنا جلایا میں نے دیکھا جب زمانے میں
 یدِ بیضا ہوا یوں ، گم ، ہو زیرِ آستیں جیسے

ہو محوِ سجدہ ، شاہوں سے نہ ہو امداد کا طالب
 کیا تھا روزِ فتر اسلاف نے بھی پاسِ دین جیسے

۲ ساتگیں - پیالہ

۱ گیا - گہاس

گزر از آنکه ندیدست و جز خبر ندهد
سخن دراز کند ، لذتِ نظر ندهد

شینده ام سخنِ شاعر و فقیه و حکیم
اگرچه نخلِ بلند است برگ و بر ندهد!

تجائی که برو پیرِ دیر می نازد!
هزار شب دهد و تابِ یک سحر ندهد

هم از خدا گله دارم که بر زبان فرسد
متاعِ دل برد و یوسفی به بر ندهد

نه در حرم نه به بتخانه یا بم آن ساقی
که شعله شعله به بخشد شرر شرر ندهد!

حذر اس کور دیدہ سے جو کچھ بھی بُجز خبر نہ دے
بہت لسان ہو لیکن تجھے ذوقِ نظر نہ دے

سنا میں نے سخن ، شاعر ، فقیہ و فلسفہ داں کا
بہت اونچا ہے نخل آن کا مگر وہ برگ و بر نہ دے!

تجلی جس پہ پیرِ دیر اتنا ناز کرتا ہے
ہزاروں شب کی خالق ہے پہ تابِ یک سحر نہ دے

خدا سے مجھ کو شکوہ ہے ، زباں تک پر نہیں آتا
متاعِ دل تو لے جائے ، کوئی یوسف مگر نہ دے

حرم میں اور نہ بتخانہ میں پایا میں نے وہ ساقی
جو بخشے شعلہ پر شعلہ ، شرارے پر شرر نہ دے!



دریں صحرا گزر افتاد شاید کاروانے را
پس از مدت شنیدم نغمه های ساربانے را

اگر یک یوسف از زندان فرعونے بروں آید
بغارت می توان دادن متاع کاروانے را!

بدرستی که در این صحرا
شاید کسی را ندانند که

کسی را ندانند که در این صحرا
کسی را ندانند که در این صحرا

کسی را ندانند که در این صحرا
کسی را ندانند که در این صحرا





گزر شاید ہوا صحرا سے تازہ کاروانوں کا
سنا ہے بعدِ مدت میں نے نغمہ ساربانوں کا

جواک یوسف کسی فرعون کے زندان سے نکلے
گوارا ہے لٹا دینا اثاثہ رھروانوں کا!



ترا نادان امیدِ غمِ گساری ها ز افرنگ است؟
دلِ شاهین نسوزد بهر آن مرغی که در چنگ است

پشیمان شو اگر لعلی ز میراثِ پدر خواهی
کجا عیشِ برون آوردنِ لعلی که در سنگ است

سخن از بود و نابودِ جهان با من چه می گوئی
من این دانم که من هستم ندانم این چه نیرنگ است

درین میخانه هر مینا ز بیمِ محتسب لرزد
مگر یک شیشهٔ عاشق که ازو لرزه بر سنگ است

خودی را پرده می گوئی؟ بگو! من باتو این گویم
مزن این پرده را چاکے که دامانِ نگه تنگ است

کهن شاخے که زیر سایهٔ او پر بر آوردی
چون برگش ریخت ازوے آشیای برداشتن ننگ است

غزل آن گو که فطرت سازِ خود را پرده گرداند
چه آید زان غزل خوانے که با فطرت هم آهنگ است

عبث امید ناداں ، بانٹ لیگا غم ترا افرنگ
دل شاہیں دکھے کیوں بہرِ طائر جو ہے زیرِ چنگ

ہے وجہ ننگ میراثِ پدر سے لعل کی خواہش
مزا تب ہے کہ حاصل ہو تجھے لعلِ درونِ سنگ

نہیں ہے بود و نابودِ جہاں سے مجھ کو دلچسپی
مجھے معلوم ہے، میں ہوں ، نہ جانے کیا ہے یہ نیرنگ

ہے خوفِ محستب سے میکدہ میں لرزاں ہر مینا
مگر عاشق کے مینا سے لرزتا رہتا ہے خود سنگ

خودی کو پردہ بے شک کہہ مگر یہ قول میرا سن
نہ کرنا چاک یہ پردہ کہ دامنِ نگہ ہے تنگ!

وہ ڈالی جس کے سائے میں نکالے بال و پر تو نے
ہو جب پت جھڑ، اٹھا لینا ہے آس سے آشیانہ ننگ

غزل وہ کہہ کہ بدلے فطرت اپنے ساز کا پردہ
غزل خواں ہے وہ کس قابل جو فطرت سے ہے ہم آہنگ

بگزر از خاور و افسونئی افرنگ مشو
 که نیرزد بجوئے این همه دیرینه ونو

چوں پر گاه که در رهگذر باد افتاد
 رفت اسکندر و دارا و قباد و خسرو

زندگی انجمن آرا و نگهدار خود است
 اے که در قافلہ بے همه شوبا همه رو

تو فروزنده تر از مهر منیر آمده
 آنچنان زی که بہر ذرہ رسائی پر تو!

آں نگینے کہ تو با اھر مناں با ختہ
 ہم بجز بیل امینے نتوان کرد گرو

از تنک جامئی ما میکده رسوا گردید
 شیشہ گیر و حکیمانہ بیاشام و برو

نہ ہو گرویدہ مغرب ، نہ ہو مشرق کا تو پیرو
کہ اک جو کے برابر بھی نہیں دیرینہ ہو یا نو

ہو جیسے تنکا کوئی رہ گزارِ باد میں گرداں
گئے اسکندر و دارا ، گئے جمشید و کیخسرو

ہے ہستی انجمن آرا ، نگہبیاں بھی ہے خود اپنی
شریکِ قافلہ ! دے ساتھ سب کا ، پر ہو تنہا رو

تو ہے خورشیدِ عالم تاب سے بڑھ کر فروزندہ
بسر کریوں کہ ہر اک ذرے تک پہنچے ترا پر تو !

نگینہ جو تو ہار آیا ہے شیطان کے مریدوں کو
نہیں کر سکتے جبریلِ امیں کے پاس بھی وہ گرو

ہمیں کم حوصلہ نکلے ، کیا میخانے کو رسوا
ہو مے آشام مینا سے حکیمانہ بہ عزمِ نو

جہانِ رنگ و بو پیدا تو می گوئی کہ راز است این
یکے خود را بتارش زن کہ تو مضراب و ساز است این

نگاہِ جلوہ بدمست از صفای جلوہ می لغزد
تو می گوئی حجاب است این نقاب است این مجاز است این!

بیا در کش طنابِ پردہ ہائے نیاگونش را
کہ مثل شعلہ عریاں بر نگاہِ پاک باز است این

مرا این خاکدانِ من ز فردوسِ بریں خوشتر
مقامِ ذوق و شوق است این حریمِ سوز و ساز است این!

زمانے گم کنم خود را زمانے گم کنم او را
زمانے ہردو را یا ہم! چہ راز است این! چہ راز است این!

ظاہر دنیا رنگ و بو کی ، تو کہتا ہے کہ راز ہے یہ
اس کے تار پہ خود دھی گر جا ، تو مضراب ہے ساز ہے یہ

مست صفائے جلوہ سے ہے آپ نگاہِ جلوہ بھی
کہتا ہے تو کہ حجاب ہے یہ ، کہتا ہے تو کہ مجاز ہے یہ !

کھینچ طناب اک جنبش سے تو اس کے نیلاگوں پردوں کی
نگہ اگر پاکیزہ ہو ، جوں شعلہ جلوہ باز ہے یہ

عرش بریں سے افضل ہے یہ خاکی بستی میرے لیے
ہے یہ مقامِ ذوق و شوق اور بزمِ سوز و ساز ہے یہ !

اپنے آپ کو کھویا کبھی ، کھویا ہے اس کو میں نے کبھی
ہر دو کبھی پا لیتا ہوں ، حیران ہوں میں کیا راز ہے یہ !

از داغِ فراقِ او در دل چمنی دارم
 اے لالہ! صحرائی! با تو سخنے دارم

ایں آہِ جگر سوزے در خلوتِ صحرا بہ
 لیکن چہ کنم کارے با انجمنی دارم!





داغِ فراقِ یار سے دل ہے چمن مثال
کہنا ہے مجھ کو لا لہُ صحرا سے اپنا حال

طالب ہے خاوتوں کی مری آہِ سینہ سوز
لیکن پچھا ہے گرد مرے انجمن کا جال



به نگاهِ آشناے چو درونِ لاله دیدم
همه ذوق و شوق دیدم همه آه و ناله دیدم

به بلند و پستِ عالم تپشِ حیات پیدا
چه دمن چه تل چه صحرا رمِ این غزاله دیدم!

نه به ماست زندگانی! نه ز ماست زندگانی!
همه جاست زندگانی! ز کجاست زندگانی!



جو نگاہِ محرمانہ سے دیکھا درونِ لالہ
ہمہ ذوق و شوق پایا، تھا سراپا آہ و نالہ

بہ بلند و پستِ عالمِ تب و تابِ زندگی ہے
ہے جہاں کے گوشہ گوشہ میں خراماں یہ غزالہ!

نہ وہاں سے زندگانی، نہ یہاں سے زندگانی!
سرِ گیتی آ کے چھائی ہے کہاں سے زندگانی!



ایں ہم جہانے آن ہم جہانے
ایں بیکرانے آن بیکرانے!

هر دو خیالے هر دو گمانے
از شعلہ من موج دخانے!

ایں یک دو آنے آن یک دو آنے
من جاودانے ، من جاودانے!

ایں کم عیارے آن کم عیارے
من پاک جانے نقد روانے!

ایں یک دو آنے آن یک دو آنے
ایں جا زمانے آنجا زمانے

یہ بھی جہاں ہے وہ بھی جہاں ہے
یہ بے کراں ہے وہ بے کراں ہے!

ہر ایک نقشِ وہم و گمان ہے
شعلے مرے کی موجِ دناں ہے!

یہ لحظہ بھر ہے وہ لحظہ بھر ہے
یہ خاک زادہ ہی جاوداں ہے!

میزاں میں یہ کم میزاں میں وہ کم
جان پاک میری نقدِ رواں ہے!

یہ بھی سرا ہے وہ بھی سرا ہے
یاں! اک زماں ہے واں اک زماں ہے



این جاچہ کارم آنجا چہ کارم؟
آپے فغانے آپے فغانے

این رهنن من آن رهنن من
این جا زیانے آنجا زیانے

هر دو فروزم هر دو بسوزم
این آشیانے آن آشیانے!





یاں کام میرا و ان کام میرا
آہ و فغان ہے ، آہ و فغان ہے

یہ میرا رهنن ، وہ میرا رهنن
اس جا زیاں ہے ، اس جا زیاں ہے

هر دو اجالوں ، هر دو جلاؤں
یہ آشیاں ہے ، وہ آشیاں ہے!



بهار آمد نگه می غلطد اندر آتشِ لاله
 هزاران ناله خیزد از دلِ پر کاله پر کاله!

فشان یک جرعه بر خاکِ چمن از باده لعلی
 که از بیمِ خزاں بیگانه روید نرگس و لاله

جهانِ رنگ و بودانی ولے دل چیست، می دانی؟
 مهرے کز حلقهٔ آفاق سازد گردِ خود هاله!



بہار آئی نگہ دوڑی درونِ آتشِ لالہ
 ہزاروں نالیے ہیں اور دل مرا پر کالہ پر کالہ !

گرا خاکِ چمن پر بادۂ لعابیں کا اک جُرعہ
 کہ آگنئے میں بلا خوفِ خزاں ہوں نرگس و لالہ

جہانِ رنگ و بو کو جانتے ہو، دل کو بھی جانو
 یہ مہ ہے، حلقہٴ آفاق جس کے گرد ہے ہالہ !



صورت گرے کہ پیکر روز و شبِ آفرید
از نقشِ این و آن به تماشای خود رسید

صوفی! بروں ز بنگہء تاریک پابنہ
فطرت متاعِ خویش بسودا گری کشید!

صبح و ستارہ و شفق و ماہ و آفتاب
بے پردہ جلوہ ہا بنگا ہے تو ان خرید!



طرح ڈالی ہے جس نے روز و شب کی ، وہ صنم آرا
 جہاں کی نقش ریزی سے ہے کرتا اپنا نظارا

نکل اے صوفئی صافی تو اب تاریک حجرے سے
 سر۔ بازار لایا مال خود فطرت کا بنجارا !

شفق ہو ، صبحِ خندان ہو ، مہ و خورشید و اختر ہو
 ہو توفیق۔ نظر تجھ کو تو ہر اک سے اٹھے پردا



باز این عالم دیرینه جوان می بایست
برگ کاهش صفت کوه گراں می بایست

کف خاکے که نگاه همه این پیدا کرد
در ضمیرش جگر آلوده فغان می بایست

این مه و مهر کن راه بجای نه برند
انجم تازه به تعمیر جهان می بایست

هر نگارے که مرا پیش نظر می آید
خوش نگارے است ولے خوشتر ازاں می بایست

گفت یزداں که چنین است و دگر ، هیچ مگو
گفت آدم که چنین است و چنان می بایست !

اک بار پھر یہ عالم۔ فرسودہ جواں ہو
تنکا بھی اس کا مرتبے میں کوہِ گراں ہو

جس مشتِ خاک کو ملی ہے چشمِ جہاں ہیں
اس کے ضمیر میں جگرِ آلودہ فغاں ہو

ان کہنہ مہر و ماہ کی منزل نہیں کوئی
پھر انجمِ نوخیر سے تعمیرِ جہاں ہو

ہے خوب ہر نگار جو پیشِ نظر رہا
زیبا تر اس سے اور اک محبوب عیاں ہو

فرمانِ حق تھا، چپ رہو، جو ہے سو ہے، یہاں
انساں مگر یہ کہہ اٹھا، اک تازہ جہاں ہو!

لاله این گلستان داغِ تمنایِ نداشت

نرگس طنازِ او چشمِ تماشا نداشت

خاک را موجِ نفس بود و دلِ پیدا نبود

زندگانی کاروانِ بود و کالایِ نداشت

روزگار از های و هوایِ میکشان بیگانه

باده در میناش بود و باده پیمایِ نداشت

برقِ سینا شکوه سنج از بے زبانی های شوق

هیچ کس در وادیِ ایمن تقاضایِ نداشت!

عشق از فریادِ ما هنگامه ها تعمیر کرد

ورنه این بزمِ خموشان، هیچ غوغایِ نداشت!

گلشن کے لالہ دل میں داغِ تمنا کوئی نہ تھا
 نرگسِ شہلا کے دیدہ میں ذوقِ تماشا کوئی نہ تھا

خاک میں موجِ نفس ساری تھی لیکن دل سے یہ عاری تھی
 قافلہٴ ہستی گرچہ رواں تھا، اس کا کالا کوئی نہ تھا

بادہ کشوں کے نعروں سے بیگانہ رہا تھا دورِ زمان
 لبریز تھا مے سے آسکا مینا، بادہ پیما کوئی نہ تھا

برقِ سینا کو یہ گلہ تھا شوق ہے کیوں محرومِ زباں
 وادیِ ایمن کی وسعت میں اہلِ تقاضا کوئی نہ تھا

عشق ہماری فریادوں سے کرتا رہا ہنگامے بپا
 ورنہ یہ تھی بزمِ خموشاں اس میں غوغا کوئی نہ تھا!

۱ کالا - سامان

ہنگامہ را کہ بست درین دیرِ دیر پائے؟
زناریانِ او ہمہ نالندہ ہم چونائے!

در بنگہ فقیر و بکاشانہ امیر
غمہا کہ پشت را بچوانی کند دوتامے
درماں کجا کہ درد بدرماں فزون شود
دانش تمام حیلہ و نیرنگ و سیمیایے

بے زورِ سیل کشتی آدم نمی رود
ہر دل ہزار عربدہ دارد بہ ناخداے

از من حکایتِ سفرِ زندگی پرس
در ساختمِ بدرد و گزشتمِ غزلِ سرایے

آمیختمِ نفس بہ نسیمِ سحر گہمی!
گشتمِ درین چمن بہ گلالِ نا نہادہ پائے

از کاخ و کو جدا و پریشاں بکاخ و کُویے
کردمِ پچشمِ ماہ تماشایے این سرایے!

ہنگامہ کس نے دیر کہن میں کیا پیا ؟
نالے پجاریوں کے ہیں از ارض تا سما!

کاشانہ امیر میں ، دارِ فقیر میں
غم ایسے ہیں جو پشتِ جوان کو کریں دوتا

درماں کہاں ، دوا سے اگر درد ہو فزوں
دانش تمام حیلہ و نیرنگ و سیمیا

بے زورِ سیل کشتی آدم نہ چل سکے
ہر دل کی سعی ہے یہی راضی ہو ناخدا

مجھ سے حکایتِ سفرِ زندگی نہ پوچھ
میں نے نبھائی درد سے ، گزرا غزل سرا

میں نے نفس نسیمِ سحر میں ملا دیا!
گزرا ہوں یوں چمن سے نہیں پھول زیرِ پا

آوارہ کاخ و کوئ میں ، الگ کاخ و کو سے ہوں
دیکھی ہے چشمِ ماہ سے میں نے یہ غم سرا!

اے لالہ اے چراغِ کہستان و باغ و راغ
در من نگر کہ می دهم از زندگی سراغ

ما رنگِ شوخ و بوے پریشیدہ نیستم
مائیم آنچه می رود اندر دل و دماغ

مستی ز بادہ می رسد و از ایاغ نیست
هر چند بادہ را نتوان خورد بے ایاغ

داغے بسینہ سوز کہ اندر شب وجود
خود را شناختن نتوان جز باین چراغ

اے موجِ شعلہ ، سینہ بہ بادِ صبا کشائے
شبم مجو کہ می دهد از سوختن فراغ!

اے لالہ! اے چراغِ کہستان و باغ و راغ
دیکھو مجھے کہ دیتا ہوں ہستی کا میں سراغ

اک رنگِ شوخ و بوئے پریشاں نہیں ہیں ہم
ہم وہ ہیں جو رواں ہے درونِ دل و دماغ

مستی شراب سے ہے، نہیں ہے ایام سے
ممکن نہیں ہے میکشی ہر چند بے ایام

اک داغِ سینہ میں جلا، ہستی کی رات میں
پہچان اپنی کے لئے لازم ہے یہ چراغ

اے موجِ شعلہ سینہ کشا ہو صبا کے رخ
شبیم نہ کر طلب کہ جو دے سوز سے فراغ!

من بنده آزادم عشق است امام من
عشق است امام من عقل است غلام من

هنگامه این محفل از گردش جام من
این کوکب شام من این ماه تمام من

جان در عدم آسوده بی ذوقی تمنا بود
مستانه نواها زد در حلقه دام من

ای عالم رنگ و بو این صحبت ما تا چند
مرگ است دوام تو عشق است دوام من!

پیدا بضمیرم او پنہاں بضمیرم او
این است مقام او دریاب مقام من!

فطرت مری آزاد ہے ، عشق مرا امام ہے
عشق مرا امام ہے ، عقل مری غلام ہے

رونقِ بزم کا سبب ، گردش ہے میرے جام کی
یہ مرا اخترِ مساء ، میرا مہِ تمام ہے

جاں تھی عدم میں بے تپش ، تھا جو نہ ذوقِ آرزو
مست ہے آس کی اب نوا ، میری اسیرِ دام ہے

عالمِ رنگ و بو تری کب تک یہ مجھ سے صحبتیں
تیرا دوام مرگ ہے ، عشق مرا دوام ہے

میرے ضمیر میں عیاں ، میرے ضمیر میں نہاں
اس کے مقام سے سمجھ میرا بھی کیا مقام ہے

کم سخن غنچه که در پرده دل راز می داشت
در هجوم گل و ریحان غم دمساز می داشت

محرمانه خواست ز مرغ چمن و باد بهار
تکیه بر صحبت آن کرد که پرواز می داشت!





۷۲

غنچہ کم سخن کے دل کی تہہ میں ایک راز تھا
ریحان و گل تھے جا بجا، آس کو غمِ دمساز تھا

یہ چاہا محرم آس کے ہوں، مرغِ چمن بادِ بہار
تکیہ کیا آن پر کہ جن کا کام ہی پرواز تھا!



خود را کنم سجودے دیر و حرم نمازده
این در عرب نمازده آن در عجم نمازده

در برگِ لاله و گل آن رنگ و نم نمازده
در ناله های مرغان آن زیر و بم نمازده

در کار گاهِ گیتی نقشِ نوی نه بینم
شاید که نقشِ دیگر اندر عدم نمازده

سیاره های گردون بے ذوقِ انقلابے
شاید که روز و شب را توفیقِ رم نمازده!

بے منزل آرمیدند پا از طلب کشیدند
شاید که خاکیاں را در سینه دم نمازده

یا در بیاضِ امکاں یک برگِ ساده نیست
یا خامهٔ قضا را تابِ رقم نمازده

سجدہ کروں میں خود کو ، دیر و حرم نہیں ہے
مفقود یہ عرب سے ، وہ در عجم نہیں ہے

اب برگِ گل کے رخ پر وہ رنگ و نم نہیں ہے
نالوں میں طائروں کے وہ زیر و بم نہیں ہے

گیتی کی کارگہ میں دیکھا نہ نقشِ تازہ
نقشِ دگر کا حامل شاید عدم نہیں ہے

حالت بدلنا بھولے سیارے آسماں کے
شاید کہ روز و شب کو توفیقِ رم نہیں ہے

منزل بغیر ٹھہرے ، پاؤں طالب سے روکے
شاید کہ خاکیوں کے سینہ میں دم نہیں ہے

خالی بیاضِ امکان میں یا ورق نہیں اب
یا خامہٴ قضا میں تابِ رقم نہیں ہے!

اغلاط نامہ

صفحہ	شعر	غلاط	صحیح
۲	۱	مئے	می
۲۵	۴	ترے	تیرے
۳۲	۵	خاک بر	خاک را بر
۳۵	۲	دائے	دانے
۷۲	۴	ترسیدن	نرمیدن
۷۶	۱	ہوائے	وائے
۹۱	۳	نہ ترکش سے گر نکلا	ترکش سے نہ گر نکلا
۱۰۸	۴	زادہ	زدہ
۱۱۲	۳	بسرو! زندگی	بسروود! زندگی
۱۱۲	۴	بشگت	بگشت
۱۳۱	۳	ہوں	ہو
۱۳۵	۴	کہ	کہہ
۱۴۲	۴	قومیت	قوسے است
۱۴۸	۳	فرد	فرو
۱۴۹	۲	پائے گا تو	پائے تو
۱۶۰	۴	نتیساں	نیستاں
۱۷۲	۵	گفتش	گفتمش
۱۷۳	۵	زیر زبر	زیر و زبر
۱۷۹	۵	نجم	بخم
۱۹۴	۶	اندر	اند
۱۹۹	۲	گنبد	گنبد
۲۰۴	۴	موسے	موسنے دارد گمان
۲۳۱	۱	جہان	جہاں
۲۷۶	۳	این	این

